جلد ۸۱ — جنوری، فروری ۱۹۹۷ء — شمارہ - ۱، ۲

ماہنامہ

پیغامِ صلح

اس شمارے میں

مختصر حالات زندگی

مجدد اعظم ـــ ۱

حضرت مرزا غلام احمد قادیانیؒ بانی سلسلہ احمدیہ

تلخیص و ترتیب: حفیظ الرحمٰن شیخ

ولادت، طفولیت اور تعلیم

بانی سلسلہ احمدیہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی پنجاب کے قصبہ قادیان ضلع گورداسپور (بھارت) میں ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے۔ آپ مشہور ایرانی قوم برلاس کے درخشندہ گوہر تھے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ برلاس کا تعلق مغل قوم سے ہے مگر یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ برلاس درحقیقت ایرانی النسل قوم ہے جو ایران سے نقل مکانی کر کے ایشیائے وسطیٰ کے علاقہ سمرقند اور اس کے گردونواح میں آکر آباد ہو گئی تھی۔ امیر تیمور اسی قوم برلاس سے تھا جو امیر تیمور گورگانی کے نام سے مشہور تھا اور حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے جد امجد ایرودم جی برلاس کا پوتا تھا۔ برلاس قوم کے جس پہلے شخص نے اسلام قبول کیا اس کا نام قاچار تھا جس کی چوتھی پشت سے میرزا غلام احمد قادیانی کے جد امجد حاجی برلاس پیدا ہوئے۔ امیر تیمور گورگانی قاچار کی چھٹی پشت سے پیدا ہوا تھا۔ یہ ایک تاریخی غلط فہمی تھی جس کے نتیجے میں امیر تیمور کو مغلیہ خاندان کا فرد لکھا گیا۔ مگر اب تحقیق سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وہ نسبی لحاظ سے منگول یا مغل نہیں بلکہ ایرانی النسل تھا۔ اس لحاظ سے میرزا غلام احمد قادیانی بھی فارسی النسل تھے۔ آپ کو الہاماً بھی اللہ تعالیٰ نے آگاہ کر دیا تھا کہ آپ فارسی النسل ہیں۔ محکمہ مال کے بندوبستی ریکارڈ (۱۸۶۵ء) میں آپ کے خاندان کا جو شجرہ نسب موجود ہے اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا خاندان برلاس کی نسل سے تھا۔ برلاس قوم گذشتہ زمانے میں ستھ یا ستھین کہلاتی تھی جس کے بارے میں اب تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ ایرانی النسل تھی۔ اس لحاظ سے حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کا مغل ہونا نہیں بلکہ ایرانی النسل ہونا ثابت ہوتا ہے۔

جائے سکونت قادیان

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے مورث اعلیٰ مرزا ہادی بیگ تقریباً دو سو آدمیوں کے ساتھ جو آپ کے اہل و عیال، ملازمین اور خدام پر مشتمل تھے، ایک معزز رئیس کی حیثیت سے مغل شہنشاہ بابر کے عہد میں ہندوستان میں داخل ہوئے۔ شہنشاہ ہندوستان نے لاہور سے تقریباً ایک سو بیس کلو میٹر کے فاصلے پر شمال مشرق میں واقع علاقہ جو اس وقت ایک وسیع غیر آباد جنگل تھا، بطور جاگیر دے دیا جسے آباد کر کے انہوں نے اپنا مسکن بنا لیا۔ شروع شروع میں اس آبادی کا نام اسلام پور رکھا گیا جو بعد میں اسلام پور قاضی ماجھی کے نام سے مشہور ہوا۔ ماجھی کا لفظ اسلام پور کے علاقہ "ماجھہ" میں واقع ہونے کے امتیاز سے اور لفظ قاضی حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے بزرگوں کو دربار دہلی کی طرف سے ملی ہوئی قضا کی نسبت سے، لوگوں نے اس قصبے کے نام کے ساتھ لگایا تھا جو بعد میں قادی اور پھر قادیاں بن گیا۔ لوگ اس قصبے کو ابتدا میں اسلام پور ماجھی قاضیاں کہتے ہوں گے جو بدلتے بدلتے اسلام پور قاضیاں یا اسلام پور قادیاں ہو گیا اور پھر صرف

قادیاں رہ گیا۔ چنانچہ اب یہ قصبہ قادیاں کے نام سے مشہور ہے۔

ولادت، طفولیت اور تعلیم

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کی صحیح تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی ٹھوس تحریری شہادت اب تک دستیاب نہیں ہو سکی تاہم آپ نے اپنی کتاب "البریہ" میں اپنا سن ولادت ۱۸۳۹ء یا ۱۸۴۰ء لکھا ہے اور وہ بھی محض قیاس یا اندازے کی بنیاد پر تحریر کیا ہے۔ آپ کی ولادت کو اہل خاندان بڑا مبارک خیال کرتے تھے کیونکہ آپ کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کی مصیبت اور تنگ دستی کے دن پھر گئے اور انہیں دوبارہ آسائش اور فراخی میسر آگئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے قادیان کے اردگرد کے بعض مواضعات، جن پر سے آپ کے والد بزرگوار مرزا غلام مرتضیٰ کی عملداری ختم کر دی گئی تھی، پھر سے بحال کر دیئے تھے اور مرزا غلام مرتضیٰ کو اپنے ماتحت ایک معزز فوجی عہدہ بھی دے دیا تھا۔ اسی وجہ سے آپ کی والدہ آپ کی پیدائش کو بہت مبارک سمجھا کرتی تھیں۔

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی جمعتہ المبارک کے دن صبح کے وقت پیدا ہوئے تھے۔ آپ توام پیدا ہوئے تھے۔ آپ سے پہلے لڑکی پیدا ہوئی تھی جس کا نام جنت رکھا گیا تھا وہ پیدا ہوتے ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس لڑکی کے بعد آپ پیدا ہوئے تھے۔ (شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربی نے اپنی کتاب "نصوص الحکم" صفحہ ۸۳ پر لکھا ہے کہ آنے والا مسیح (آخری مولود) جو بنی نوع انسان میں پیدا ہو گا اور اللہ تعالیٰ کے اسرار کا حامل ہو گا اور خاتم الولایت ہو گا توام پیدا ہو گا اس کے ساتھ اس کی بہن پیدا ہو گی جو پہلے پیدا ہو گی اور وہ اس کے بعد پیدا ہو گا اور وہ خاتم الاولاد ہو گا)۔

آپ کی طفولیت کا زمانہ نہایت پاکیزہ اور معجز نما تھا۔ فطرتاً آپ کو بچپن ہی سے دنیا اور دنیا کی چیزوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا حتیٰ کہ آپ کے والد ماجد نے آپ کے بہلانے کے لئے بطور خاص جو کھلونے فراہم کئے تھے آپ ان سے بھی نہیں کھیلتے تھے۔ قصبے سے جو بچے گھر میں آتے کہ آپ سے کھیلیں کودیں آپ ان سے بھی گھل مل نہ سکے۔ آپ کے طور طریقوں اور بشرہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوچ بچار میں مستغرق ہیں جیسے کسی عظیم الشان کام کی تیاری کر رہے ہوں۔

تعلیم

اس وقت عام رواج یہ تھا کہ رؤسا اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے اتالیق مقرر کیا کرتے تھے۔ جب آپ چھ سات سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کے والد ماجد نے بھی آپ کی تعلیم کے لئے ایک فارسی خواں معلم مقرر کیا جس کا نام فضل الٰہی تھا۔ انہوں نے آپ کو قرآن مجید اور فارسی کی چند کتابیں پڑھائیں۔ جب آپ دس سال کے ہوئے تو مولوی فضل احمد سیالکوٹی، جو عربی زبان پر خاصا عبور رکھتے تھے اور نہایت متقی اور دیندار بزرگ تھے، آپ کی تعلیم و تربیت کے لئے مقرر کئے گئے۔ جب آپ نے دعویٰ مجددیت و محدثیت کیا تو مولوی فضل احمد نے بلا تامل شہادت دی اور بتایا کہ دوران تعلیم مرزا غلام احمد کے بصیرت افروز نکات سن سن کر یہ نظر آگیا تھا کہ یہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے۔ ان بزرگ سے حضرت مرزا غلام احمد قادیانی نے صرف کی بعض کتابیں اور نحو کے قواعد پڑھے۔ اس کے بعد آپ کو مزید تعلیم کے لئے مولوی سید گل علی شاہ جو شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے کے سپرد کر دیا گیا جن سے آپ نے صرف، نحو، منطق اور حکمت وغیرہ علوم مروجہ کی تعلیم حاصل کی۔ شروع شروع میں یہ مولوی صاحب قادیان میں ہی رہ کر آپ کو پڑھاتے رہے بعد میں بٹالہ چلے گئے تو حضرت مرزا صاحب کو بھی ان کے ہمراہ بھیج دیا گیا جہاں

مولوی صاحب کی شاگردی میں مولوی محمد حسین بٹالوی بھی آپ کے ہم مکتب رہے جنہوں نے بعد میں اپنے رسالہ "اشاعت السنہ" کی جلد نمبر۷ میں اپنے قلم سے حضرت مرزا صاحب کی کتاب "براہین احمدیہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر کیا کہ

"مولف براہین احمدیہ کے حالات و خیالات سے جس قدر ہم واقف ہیں ہمارے معاصرین میں ایسے واقف کم نکلیں گے .... مولف ہمارے ہم وطن ہیں بلکہ اوائل عمر کے (جب ہم قطبی و شرح ملا پڑھتے تھے) ہمارے ہم مکتب تھے اس لئے ہمارا یہ کہنا کہ ہم ان کے حالات و خیالات سے بہت واقف ہیں' مبالغہ قرار نہ دیئے جانے کے لائق ہے ...... اس کا (براہین احمدیہ کا) مولف بھی اسلام کی مالی و جانی و قلمی و لسانی و مالی نصرت میں ایسا ثابت قدم نکلا ہے کہ جس کی نظیر پہلے مسلمانوں میں بہت کم پائی گئی ہے۔"

پھر آگے چل کر اپنے ان الفاظ کو تحدی کے رنگ میں پیش کرتے ہوئے مولوی محمد حسین بٹالوی لکھتے ہیں کہ

"ہمارے ان الفاظ کو کوئی ایشیائی مبالغہ سمجھے تو ہم کو کم از کم ایک ایسی کتاب بتا دے جس میں جملہ فرقہائے مخالفین اسلام' خصوصاً" آریہ سماج و برہمو سماج سے اس زور شور سے مقابلہ پایا جاتا ہو اور دو چار ایسے اشخاص انصار اسلام کی نشاندہی کرے جنہوں نے اسلام کی نصرت مالی و جانی و قلمی و لسانی کے علاوہ نصرت مالی کا بیڑہ اٹھا لیا ہو اور مخالفین اسلام اور منکرین الہام کے مقابلہ میں مردانہ تحدی کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہو کہ ---- جس کو وجود الہام کا شک ہو وہ ہمارے پاس آ کر تجربہ و مشاہدہ کرے' ---- اور اس تجربہ و مشاہدہ کا اقوام غیر کو مزہ بھی چکھا دیا ہو۔"

مولوی محمد حسین بٹالوی خود بہت بڑے عالم اور محدث تھے مگر اس کے باوجود حضرت مرزا غلام احمد کا اس قدر احترام کرتے تھے کہ اکثر اوقات آپ کا جوتا سیدھا کر کے آپ کے سامنے رکھ دیتے تھے اور اپنے ہاتھ سے آپ کو وضو کرانا اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ وہ نہ صرف حضرت صاحب کے اعلیٰ کردار' اخلاق فاضلہ اور ناصر دین اسلام ہونے کے قائل تھے بلکہ آپ کو ملہم ربانی اور صاحب حال بھی سمجھتے تھے گو بعد میں حضرت مرزا غلام احمد قادیانی سے ان کا نظریاتی اختلاف ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود وہ آپ کی پاکیزہ زندگی پر کوئی الزام نہ لگا سکے۔ حضرت مرزا صاحب نے بھی مولوی محمد حسین بٹالوی کے نام اپنی ایک کھلی چٹھی میں بڑی تحدی سے یہ تحریر فرمایا تھا کہ

"اگر آپ طالب حق بن کر میری سوانح پر نظر ڈالیں تو آپ پر قطعی ثبوتوں سے یہ بات کھل سکتی ہے کہ خدا تعالیٰ ہمیشہ کذب کی ناپاکی سے مجھے محفوظ رکھتا رہا ہے یہاں تک کہ بعض وقت انگریزی عدالتوں میں میری جان و عزت ایسے خطرہ میں پڑ گئی کہ بجز استعمال کذب اور کوئی صلاح کسی وکیل نے مجھ کو نہ دی لیکن اللہ جل شانہ کی توفیق سے میں سچ کے لئے اپنی جان اور عزت سے دست بردار ہو گیا اور بسا اوقات مالی مقدمات میں محض سچ کے لئے بڑے بڑے نقصان اٹھائے اور بسا اوقات محض خدا تعالیٰ کے خوف سے اپنے والد اور اپنے بھائی کے برخلاف گواہی دی اور سچ کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ اس گاؤں (قادیان) میں اور نیز بٹالہ میں میری ایک عمر گزر گئی ہے مگر کون ثابت کر سکتا ہے کہ میرے منہ سے کبھی جھوٹ نکلا ہو۔ پھر جب میں نے محض للہ انسانوں پر جھوٹ بولنا متروک رکھا اور بارہا اپنی جان و مال کو صدق پر قربان کیا تو پھر میں خدا تعالیٰ پر کیوں جھوٹ بولتا۔"

مقام غور ہے کہ ایک شخص اپنے ہم وطنوں' واقف کار لوگوں اور ہم مکتبوں میں اپنی راستبازی کا دو ٹوک الفاظ میں دعویٰ کرتا ہے اور کوئی شخص اس کے دعوے کو چیلنج نہیں کر سکتا فقد لبثت فیکم عمرا من قبلہ (۱۶:۱۰) میں نے اس سے قبل ایک عمر

تمہارے درمیان گذاری ہے کیا کوئی عیب بتا سکتے ہو یا الزام لگا سکتے ہو --- کے قرآنی معیار کے ماتحت یہ حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوے مجددیت و محدثیت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ہے کہ آپ کے دعویٰ سے قبل کی زندگی کا کوئی جھوٹ یا کوئی کمزوری نہ بتائی جا سکی۔

مطالعہ کی عادت

حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ اپنی درسی کتب کے علاوہ جن کتابوں کا آپ باقاعدگی کے ساتھ مطالعہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے وہ تھیں قرآن شریف، صحیح بخاری، فتوح الغیب، مثنوی مولانا روم، دلائل الخیرات، تذکرۃ الاولیا، سفر السعادت وغیرہ۔ اس سے آپ کے مذاق دینی و اخلاقی کا پتہ لگتا ہے کہ کس قدر پاکیزہ تھا۔

قرآن شریف سے عشق

آپ کو قرآن شریف سے اس قدر والہانہ عقیدت تھی کہ کتاب الٰہی کو آپ نے جز و حیات بنا لیا۔ دن رات کے اکثر حصہ وقت کو قرآن مجید کی تلاوت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے ٹہلتے قرآن مجید ہی پڑھتے رہتے تھے اس کے معارف و حقائق کا علم پانے کے لئے ہمہ تن غور و فکر میں مستغرق رہتے اور نہایت عجز و انکساری سے دعائیں کرتے۔ جب کسی آیت کا مفہوم آپ پر کھل جاتا تو اپنی یادداشت کے لئے اسے تحریر کر لیتے۔ آپ کا معمول تھا کہ قرآن مجید کے مطالعہ کے دوران اپنے قلم سے حاشیہ پر اوامر و نواہی سے متعلق نوٹ لکھتے جاتے تھے۔ آپ نے قرآن شریف کتنی بار ختم کیا؟ اس کا صحیح علم تو حاصل نہیں ہو سکا تاہم مرزا سلطان احمد (آپ کے بڑے فرزند ارجمند) کے بیان کے مطابق آپ نے قرآن شریف ایک ہزار بار سے زیادہ ضرور پڑھا اور ختم کیا ہو گا۔

خلوت پسندی

انسانی فطرت ہے کہ جوں جوں جوانی کی طرف قدم بڑھتے جاتے ہیں دنیا کی محبت کے جذبے اور لہو و لعب کی طرف رجحان میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے مگر حضرت مرزا غلام احمد قادیانی کو طبعاً چونکہ لہو و لعب سے سخت نفرت تھی اس لئے جیسے جیسے جوانی آتی گئی ویسے ویسے ہی آپ کی محبت و عبادت الٰہی میں انہماک و استغراق اور عشق قرآن میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ جلوت ہوتی یا خلوت، سوائے ذکر الٰہی اور یاد الٰہی کے آپ کا اور کوئی مشغلہ نہ ہوتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس معمول میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ محبت الٰہی کا جذبہ جو آپ کی فطرت میں بطور بیج بویا گیا تھا اور عشق قرآن، جو آپ کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا روز افزوں ترقی کرتا چلا گیا۔

دورِ تعلیم کا ایک اہم ترین واقعہ

حضرت اقدس، مجدد صد چہاردہم، جبکہ اپنی عمر کے پہلے حصہ میں ہنوز تحصیل علم میں مشغول تھے۔ بذریعہ رویاء آپ کو سرتاج مدینہ، نور دو عالم، خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک کا شرف حاصل ہوا۔ آنحضورؐ کی اس زیارت کے بعد آپ تاحیات عشق رسولؐ میں فنا رہے۔ اس عظیم الشان دیدار جلوۂ محمدیؐ کا دلکش اور وجد آفریں پیرائے میں ذکر کرتے ہوئے حضرت اقدس "آئینہ کمالات اسلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ

(ترجمہ) --- "اوائل ایام جوانی میں ایک رات میں نے رویا میں دیکھا کہ میں ایک عالی شان مکان میں ہوں جو نہایت پاک اور صاف ہے اور اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور چرچا ہو رہا ہے میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ حضورؐ کہاں تشریف فرما ہیں؟ انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ میں دوسرے لوگوں

کے ساتھ مل کر اس کے اندر چلا گیا اور جب میں آنحضورؐ کی خدمت میں پہنچا تو آنحضورؐ بہت خوش ہوئے اور مجھے بہتر طور پر میرے سلام کا جواب دیا۔ آپؐ کا حسن و جمال اور ملاحت اور آپؐ کی پر شفقت اور پر محبت نگاہ مجھے اب تک یاد ہے اور وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکتی۔ آپؐ کی محبت نے مجھے فریفتہ کر لیا اور آپؐ کے حسین و جمیل چہرہ نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اس وقت آپؐ نے مجھے فرمایا ----- اے احمد! تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا چیز ہے؟--- جب میں نے اپنے دائیں ہاتھ کی طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے ہاتھ میں ایک کتاب ہے اور وہ مجھے اپنی ہی ایک تصنیف معلوم ہوئی۔ میں نے عرض کیا حضورؐ یہ میری ایک تصنیف ہے"۔

"آنحضرتؐ نے اس کتاب کو دیکھ کر عربی زبان میں پوچھا کہ تو نے اس کتاب کا کیا نام رکھا ہے؟ خاکسار نے عرض کیا کہ اس کتاب کا میں نے قطبی نام رکھا ہے ..... غرض آنحضرتؐ نے وہ کتاب مجھ سے لے لی اور جب وہ کتاب حضرت مقدس نبیؐ کے ہاتھ میں آئی تو آنجنابؐ کا دست مبارک لگتے ہی ایک نہایت خوش رنگ اور خوبصورت میوہ بن گئی کہ جو امرود سے مشابہ تھا مگر بقدر تربوز تھا۔ آنحضرتؐ نے جب اس میوہ کو تقسیم کرنے کے لئے قاش قاش کرنا چاہا تو اس قدر اس میں سے شہد نکلا کہ آنجنابؐ کا ہاتھ مبارک مرفق تک شہد سے بھر گیا۔ تب ایک مردہ جو دروازے کے باہر پڑا تھا آنحضرتؐ کے معجزہ سے زندہ ہو کر اس عاجز کے پیچھے آکھڑا ہوا اور یہ عاجز آنحضرتؐ کے سامنے کھڑا تھا جیسے ایک مستغیث کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور آنحضرت بڑے جاہ و جلال اور حاکمانہ شان سے ایک زبردست پہلوان کی طرح کرسی پر جلوس فرما رہے تھے"۔

"پھر خلاصہ کلام یہ کہ ایک قاش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو اس غرض سے دی کہ قاش اس شخص کو دوں جو نئے سرے سے زندہ ہوا اور اور باقی تمام قاشیں میرے دامن میں ڈال دیں اور وہ قاش میں نے اس نئے زندہ کو دے دی اور وہ اس نے وہیں کھالی۔ پھر جب وہ نیا زندہ اپنی قاش کھا چکا تو میں نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کرسی اونچی ہو گئی ہے حتیٰ کہ چھت کے قریب جا پہنچی ہے اور میں نے دیکھا کہ اس وقت آپؐ کا چہرہ مبارک ایسا چمکنے لگا کہ گویا اس پر سورج اور چاند کی شعاعیں پڑ رہی ہوں۔ میں ذوق وجد کے ساتھ آپؐ کے چہرہ مبارک کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے آنسو بہہ رہے تھے پھر میں بیدار ہو گیا اور اس وقت میں کافی رو رہا تھا اور اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ وہ مردہ شخص اسلام ہے اور اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی فیوض کے ذریعہ سے اسے اب میرے ہاتھ پر زندہ کرے گا۔ اللھم صلی علی محمد و علی آل محمد و بارک و سلم انک حمید مجید۔"

(آئینہ کمالات اسلام ص ص ۵۴۹-۵۴۸ و براہین احمدیہ حصہ سوم ص ۲۴۹)

انگریزی سے ترجمہ

اسلام میں ریاست کا تصور ---۱

خدا اور عوام کے سامنے جوابدہ ہونے کا عملی نمونہ

حضرت مولانا محمد علی صاحب، مفسر قرآن

کاوش: کیپٹن عبدالسلام خاں

ریاست کا جدید تصور

ریاست کے تمام جدید تصورات میں ایک چیز مشترک ہے یعنی مادی فوائد جس نے مہذب دنیا کے نظریات کو اس قدر متاثر کیا ہے کہ خدا اور مذہب کو طاق نسیاں میں دھکیل دیا گیا ہے حتیٰ کہ ان ممالک میں جو اب بھی حضرت مسیحؑ اور عیسائیت سے برائے نام اطاعت کا تعلق رکھتے ہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ جہاں تک خدا کی اعلیٰ حاکمیت کا تعلق ہے، جدید ریاستیں، اس بارے میں کوئی متفقہ رائے نہیں رکھتیں مگر عجیب بات ہے کہ وہ دو نئے خداؤں کی پرستش میں ایک ہیں۔ مغربی تہذیب نے خدا، جسے وہ ایک قصہ پارینہ قرار دے کر چھوڑ چکے ہیں، کی جگہ لینے کے لئے دو نئے خدا بنا لئے ہیں۔ "قوم اور ریاست" دو نئے بت ہیں جن کے سامنے آج کا مہذب انسان سجدہ میں گرا ہوا ہے اور ایک پرانے خدا شاید سب سے پرانے خدا یعنی خدائے سیم و زر، کے ساتھ ملا کر اب ایک نئی تثلیث، چرچ کی تثلیث کی جگہ، ظہور پذیر ہوئی ہے۔ چونکہ آج کے مہذب انسان کے لئے اقتصادی فوائد یا دولت کا حصول واحد قابل لحاظ امر ہے اس لئے وہ اس مدعا کے حصول کے لئے کوئی بھی قربانی جو اس سے مانگی جائے کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے چاہے یہ قربانی ریاست کی خاطر ہو یا قوم کی خاطر۔ پس دولت، قوم اور ریاست آج کے مہذب انسان کے دل میں بلند ترین عزت کا مقام رکھتے ہیں اور وہ ان بتوں کی پرستش کرتا ہے۔ جھکنے کی خواہش انسانی فطرت میں پائی جاتی ہے اور انسان اپنے خالق کے سامنے نہیں جھکتے تو وہ اپنی خود ساختہ اشیاء کے سامنے ضرور جھکیں گے! تاہم ان ناسزاوار چیزوں کی عبادت نے ہمیشہ بنی نوع انسان کو تباہی کی طرف دھکیلا ہے اور خدائے سیم و زر اور اس کے دو شریک "قوم اور ریاست" تمام انسانی تہذیب کو اس وقت بھی تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہے ہیں۔

مغرب میں "ریاست" خواہ اسے جمہوریت یا کمیونسٹ یا فاشٹ ریاست کا لیبل لگا دیا گیا ہو توسیع پسندی، جارحیت اور کمزوروں کے استحصال میں یقین رکھتی ہے۔ یہ صرف میکاولی ہی نہ تھا جس کے نزدیک اور جب سالمیت ریاست داؤ پر لگی ہو تو "ہر اصول کو ایک طرف رکھ دینا چاہئے۔ بلکہ انصاف اور ناانصافی کا لحاظ ایک بے وزن چیز تھی۔" وہ لوگ بھی جو اسے مطعون کرتے ہیں اسی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ دنیا کا تمام سونا قبضہ میں لانے کے بعد اور اپنے بموں اور بمباروں کے زور پر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں ایک اور اضافی حق بھی حاصل ہے، یعنی دوسروں کی تقدیر کو کنٹرول کرنے کا حق تاکہ وہ اپنے لوگوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مادی فوائد حاصل کر سکیں۔

جارحیت، خواہ اس کا چہرہ کیسا بھی ہو آج کی مہذب ریاست کا نچوڑ ہے۔ کمزور کے کوئی حقوق نہیں، حقوق صرف انہیں کے ہوتے ہیں جن کے پاس طاقت ہے اور وہ جن میں عزت اور توجہ حاصل کرنے کی قوت ہے۔ یہ ذہنیت مغربی اقوام نے تشکیل دی ہے۔ نتیجتاً ریاستیں فوجوں اور اسلحہ کی دوڑ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں لگ گئی ہیں اور اس کا نتیجہ مختلف ریاستوں کی محاذ آرائیوں اور ایک دوسرے کو تباہ کرنے کی خواہش کی صورت میں نکل

رہا ہے۔ اس صورت حال کی تمام تر ذمہ داری ریاست کے مادیت بھرے تصور پر ہے۔ ہر ریاست کو لازماً اقتدار اور طاقت تفویض کرنی پڑتی ہے جس سے وہ جارحیت کا مقابلہ کر سکے اور کمزوروں کا دفاع کر سکے اور تمام لوگوں کو مساوی انصاف مہیا کر سکے۔ سائنس کی ترقی نے اس ریاستی طاقت کو ایک ہزار گنا زیادہ کر دیا ہے۔ دوسری طرف زندگی کو مادی نظریہ کی عینک سے دیکھنے کی وجہ سے انسان اپنے ساتھی انسانوں کے خلاف طاقت کے استعمال میں زیادہ بے تامل ہو گیا ہے اور نیچر کو فتح کرنے میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس نے خود انسان کو اپنے نفس پر غلبہ حاصل کرنے کے مجاہدہ کو ست کر کے پس منظر میں دھکیل دیا ہے حالانکہ یہ مجاہدہ نفس ہی ہے جو انسان پر انسان استبداد کو قابو میں رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ریاست کی بڑھتی ہوئی طاقت جو کہ لازماً افراد کے ذریعہ ہی استعمال ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ انسان کو استبداد سے نجات دلواتی اور حق اور انصاف کے مقصد کو قائم کرنے میں استعمال ہوتی۔ وہ انسان کو غلام بنانے اور تباہ کرنے میں استعمال کی جا رہی ہے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ گو سائنس نے انسان کو خدائی طاقتوں سے آراستہ کیا ہے مگر آج کا مہذب انسان ان اصولوں کے استعمال میں ایک وحشی کی ذہنیت رکھتا ہے۔ ریاست بجائے اس کہ اپنے مقصد غائی یعنی بنی نوع انسان کی خوشحالی کو ترقی دینے میں مددگار ہوتی۔ انسانی خوشحالی کے لئے ایک خطرہ بن گئی ہے اور فرد واحد اس بت سے اتنا سحرزدہ ہو گیا ہے کہ وہ طوعاً و کرہاً" بنی نوع انسان کو تباہ کرنے والی اس مشین کا ایک پرزہ بن کر کام کر رہا ہے۔

ریاست کی روحانی اساس کا صحیح مفہوم

اسی برائی کا تدارک کرنے کے لئے اسلام ریاستی اتھارٹی کو ایسے افراد کے ہاتھ میں سپرد کرنے کا تقاضا کرتا ہے جو کہ خوف خدا رکھنے والے ہوں۔ حضور نبی کریم صلعم نے جس ریاست کی بنا رکھی اسے بھی جسمانی طاقت سے آراستہ کیا گیا تھا جیساکہ ہر ریاست کے لئے لازماً ہونا چاہئے مگر حضورؐ نے بنی نوع انسان کی ایک منفرد خدمت انجام دی کہ انہوں نے سب سے عظیم انسانی طاقت کو روحانیت کے رنگ سے رنگین کر دیا۔ اسلام میں ریاست کا سربراہ امیر (جو حکم دیتا ہے) بھی کہلاتا ہے اور امام بھی (وہ فرد جس کے نمونہ کی تتبع کی جاتی ہے) یعنی ایک ایسا انسان جو نہایت اعلیٰ اخلاقی حالت پر قائم ہو۔ اپنے بستر مرگ پر حضور صلعم نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنی غیر موجودگی میں امام الصلوۃ بنا کر عندیہ دے دیا کہ ان کے بعد کون ریاست کا سربراہ ہونا چاہئے اور واقعی حضرت ابوبکرؓ ہی اس عہدہ کے لئے موزوں ترین انسان تھے۔ ایک لمبے عرصہ تک اس پر عمل ہوتا رہا اور ریاست کا سربراہ امام الصلوۃ بھی ہوتا تھا۔ تقویٰ اور راست بازی یعنی خوف خدا اور دوسروں کے حقوق کا پاس' ایک شخص کے لئے حکومت کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ اتنی ہی لازمی شرط تھی۔ روحانی طاقت ہی صرف ایک ایسی طاقت ہے جو کسی شخص کو تفویض کردہ دنیاوی طاقت اور اختیار کو کنٹرول کرنے کے قابل بنا سکتی ہے ورنہ اس روحانی طاقت کی عدم موجودگی میں دنیاوی اختیار کے غلط استعمال کا خطرہ ہر دم رہتا ہے۔ اس لئے ابتدائی اسلامی ریاست کی تنظیمی شکل جس میں روحانی اور دنیاوی سربراہ قوم کا عہدہ یکجا کر دیا گیا تھا' ایک کامل ترین شکل تھی جو کہ ریاستی امور کی تنظیم کی تاریخ پیش کر سکتی ہے۔ ریاست کا سربراہ اولاً اپنے دنیاوی اختیارات کے استعمال میں سب سے پہلے اپنے آپ کو خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا تھا۔ پس جس ریاست کی حضور نبی صلعم نے بنیاد رکھی اس کی بنیادیں روحانی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بنیادیں جمہوری بھی تھیں یعنی اس لفظ کے صحیح ترین معنوں میں جمہوری تھیں۔

تھیوکریسی کی نفی

کچھ حلقوں میں یہ غلط تصور پایا جاتا ہے کہ اسلامی ریاست ایک

تھیوکریسی تھی۔ مسلم ریاست کا سربراہ کبھی بھی اپنے آپ کو زمین پر خدا کا نمائندہ نہیں سمجھتا تھا بلکہ عوام کا نمائندہ سمجھتا تھا' جنہوں نے اسے لوگوں کی خدمت کرنے کے لئے منتخب کیا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے اختیارات کے استعمال میں اپنے ہر عمل کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھتا تھا۔ تمام لوگ بشمول سربراہ ریاست کے مساوی حقوق و فرائض رکھتے تھے اور ایک ہی قانون کے ماتحت آتے تھے۔ خود حضور صلعم نے اپنے آپ کے لئے کوئی ایسے حقوق محفوظ رکھنے کا دعویٰ نہیں کیا جو کہ دوسرے لوگوں کو حاصل نہ تھے۔ ریاستی تنظیم' جس کو حضورؐ نے بنایا تھا اور جس کے وہ سربراہ تھے اس کے روزمرہ کے کام کرنے میں خود حضورؐ میں اور دوسروں میں کوئی امتیاز نہیں پایا جاتا تھا۔ غیر آتے تھے اور پوچھتے تھے: تم میں سے محمدؐ کون ہے' حضورؐ انتہائی سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے اور ایک فرمانروا ہونے کے ناطے انہوں نے کبھی کسی فضیلت کا دعویٰ نہیں کیا۔

جس وقت سپاہی مدینہ کی دفاع کے لئے خندق کھود رہے تھے حضورؐ بھی وہاں اپنی کدال اٹھائے موجود تھے اور جس وقت صحابہ مٹی اور پتھروں کے ڈھیروں کو اٹھاتے تھے تو حضورؐ بھی ان گرد آلود مزدوروں میں شامل تھے۔ اگر آج تک کوئی ایسی جمہوریت ہوئی ہے جو وراثت' رتبہ اور مراعات کی ناہمواریوں سے مبرا تھی تو وہ وہ جمہوری ریاست تھی جس کی بنیاد حضور صلعم نے رکھی۔ شاید حضرت عمر فاروقؓ' حضور صلعم کے دوسرے جانشین سے بڑا فاتح تاریخ انسانی پیش نہ کر سکے جو بیک وقت فاتح بھی تھے اور ایڈمنسٹریٹر بھی۔ پھر بھی وہ اپنے سے کم تر رتبہ کے شہریوں کو انہیں عوام میں سرزنش کرنے سے نہیں روکتے تھے۔ روایت بیان کی جاتی ہے کہ ایک دفعہ ایک عام شہری نے بار بار انہیں ٹوکا۔ "اے عمر! خدا کا خوف کرو" وہ آدمی کہتا رہا اور جب دوسرے لوگ اسے منع کرنا چاہتے تھے تو حضرت عمرؓ نے خود یہ کہتے ہوئے مداخلت کی: "اسے ایسا کہنے دو! ان لوگوں کا کیا فائدہ اگر وہ مجھے ایسی باتیں نہ بتائیں! چار بادشاہوں کے فرمانروا نے ایک دفعہ رات کو بھیس بدل کر ایک قحط زدہ کیمپ کا دورہ کیا اور دیکھا کہ وہاں ایک عورت ہے جس کے پاس بچوں کو کھانا دینے کے لئے کچھ نہیں ہے وہ بھاگم بھاگ مدینہ پلٹے جو تین میل کی مسافت تھی اور خود اپنی پشت پر ایک آٹے کی بوری اس مصیبت زدہ عورت اور اس کے بچوں کے لئے اٹھا کر لے گئے۔ جب کسی خادم نے پیشکش کی کہ میں یہ بوجھ اٹھا لیتا ہوں تو فرمایا: اس زندگی میں تو تم میرا بوجھ اٹھا سکتے ہو مگر قیامت کے دن میرا بوجھ کون اٹھائے گا!"

بااین ہمہ جب یہ عوام کا عظیم خادم اپنے بستر مرگ پر لیٹا ہوا تھا اور ایک نوجوان نے ان کی عظیم خدمات کو سراہا تو فرمایا: "بس بس' نوجوان! اتنا ہی بہت ہو گا کہ میں نے اپنے اختیارات کے استعمال میں جو کوتاہیاں کی ہیں میرے اچھے کاموں کی وجہ سے وہ بے اثر ہو جائیں!" صرف یہی ایک ذہنیت ہے جو کہ انسانوں کو اپنے ساتھی انسانوں پر حکومت کرنے کے قابل بناتی ہے۔ مگر یہ ذہنیت صرف خدا پر ایک محکم ایمان اور اس کے روبرو اپنے ذمہ داری کے احساس سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ تھی ایک ذمہ دار حکومت جو اسلام نے پیدا کی جسے ایسے انسان چلاتے تھے جو یہ ادراک رکھتے تھے کہ سب چیزوں سے بڑھ کر ان کا اپنے ہر عمل کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہونا ہے۔

اہلیت اور عدل کا معیار

کسی آدمی کو کمان سپرد کردینا یقیناً اس کی عزت افزائی ہی ہوتی تھی جن افراد کو عزت دی جاتی تھی وہ ایسے لوگ ہوتے تھے جو اپنے فرائض کا بہت زیادہ پاس رکھتے تھے۔ "تحقیق اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو (یعنی ذمہ داری والے عہدوں کو) ان کے اہل کے سپرد کرو" (۴:۵۶)

یہ آیت مسلمانوں کو بادشاہت عطا ہونے کے بارہ میں ہے اور یہاں انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ ریاستی امور کو ایسے لوگوں کے سپرد

کریں جو کہ اس ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے کے اہل ہوں اور بعد کے الفاظ "کہ جب تم فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو" لفظ امانت یعنی اعتماد والے عہدے' کے مفہوم کی تائید کرتے ہیں اور یہ پوری آیت حاکم و محکوم کے مابین فرائض کو بیان کرتی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے لفظ امانت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد فرائض ہیں۔ حضور صلعم نے خود امانت کے لفظ کی تشریح بمعنی "گورنمنٹ" یا "ریاست کے امور" کی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جب امانت ضائع کی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرو۔ پوچھا گیا کہ امانت کس طرح ضائع ہو گی یارسول اللہ! فرمایا "جب گورنمنٹ اس کے نااہل لوگوں کے سپرد کی جائے گی تو تباہی کے منتظر ہو جاؤ" (بخاری ۳۵:۸۱)

کوئی بھی شخص جسے کوئی اختیار دیا جائے اسے کہا گیا کہ وہ اپنے دائرہ کار میں ایک فرمانرواں کی حیثیت رکھتا ہے اور جو لوگ بھی اس کے ماتحت ہیں ان کے بارہ میں وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہو گا: "تم میں سے ہر شخص ایک حکمران ہے اور ہر شخص سے اپنی رعایا کے بارہ میں پوچھا جائے گا۔ ایک بادشاہ ایک حکمران ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارہ میں سوال ہو گا۔ ایک مرد اپنے اہل و عیال کے اوپر حکمران ہے اور اس سے اس کے زیر نگہداشت افراد کے بارہ میں پوچھا جائے گا۔ ایک عورت اپنے خاوند کے گھر کے اوپر حکمران ہے اور اس سے اس کے زیر نگہداشت لوگوں کے بارہ میں سوال ہو گا اور ایک نوکر اپنے مالک کے اثاثوں اور املاک کے اوپر حکمران ہے اور وہ ہر اس چیز کے بارہ میں جو اس کے سپرد کی گئی جواب دہ ہو گا (بخاری ۱۱:۱۱)۔ اس طرح ایک فرماں رواں یا ریاست کا سربراہ ان تمام لوگوں کی طرح جو کوئی اتھارٹی یا اختیار رکھتے ہیں اسی درجہ میں رکھا گیا ہے جس میں ایک نوکر رکھا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک نوکر کے حوالہ جب کچھ املاک کی جاتی ہیں اور وہ ان املاک کے بارہ میں مالک کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسی طرح جو لوگ بھی ریاست کے اختیار کے امین بنائے جاتے ہیں خواہ وہ کسی پوزیشن میں ہوں' وہ لوگوں کا خیال رکھنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کے امین ہوتے ہیں اور اپنے فرائض کی کماحقہ انجام دہی کے لئے وہ سب سے پہلے تو اپنے اصلی مالک یعنی خدا کے سامنے اور پھر اپنے عوام کے سامنے جنہوں نے اسے یہ ذمہ داری سپرد کی ہوتی ہے' جوابدہ ہوتے ہیں۔ ایک اچھی ریاستی تنظیم کی سب سے پہلی ضرورت یہ ذہنیت ہے جو کہ اس کے ہر ممبر میں موجود ہونی چاہئے اور اسی لئے ریاست کے اسلامی تصور میں اس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔

انگریزی سے ترجمہ

بے نظیر روحانی انوار کا الٰہی سرچشمہ ---۴

شیخ غلام ربانی ایم اے' ایل ایل بی

باب سوم- قرآن مجید کے مستند ہونے کا ناقابل تردید ثبوت

اسلام میں دین کا تیسرا رکن خدا کی کتابوں پر ایمان رکھنا ہے۔ جو اس نے نسل انسانی کی ہدایت کے لئے وقتاً" فوقتاً" اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی ہیں۔ بنیادی مقصد ان ذرائع کی الہیاتی سکیم اختیار کرنے کا یہ تھا کہ آدم کی نسل کو خدائے واحد کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بلایا جائے تاکہ وہ سکون پا سکے۔ یعنی نسل انسانی امن سے ہمکنار ہو سکے اور جس سے آدم کی نسل ارادہ حقیقت الٰہی سے ہم آہنگ ہو جائے۔

وحی کے اس الٰہی منصوبے میں قرآن پاک ایک یکتا حیثیت کا مالک ہے کیونکہ یہ خدا تعالٰی کا آخری میثاق ہے جس کے ذریعہ اس سے پہلے کے صحائف کو محفوظ بھی کیا گیا اور ان کی تصدیق بھی کی گئی اور ان میں جو تحریف اور غلط باتیں در آئی تھیں ان کو ٹھیک کر دیا گیا ہے اور الٰہی ہدایت کو آنے والے زمانے کے لئے مکمل کر دیا گیا۔

"ہم نے تیری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری اس کی تصدیق کرتی ہوئی جو اس سے پہلے کتاب میں سے ہے اور اس پر نگہبان۔ سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ جو تیرے پاس حق آیا۔ ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر" (۴۸:۵)۔

قرآن پاک ہی اسلام کی مقدس کتاب ہے اور مسلمان جو بحیثیت ایک جماعت کے اس کو مانتے ہیں اس کے ذمہ دار ہیں۔ وہ اس کے محافظ ہیں اور ان کی اس سے ہی پہچان ہے۔ بہرکیف ایک ہدایت نامہ اور ایک جامع ضابطہ حیات ہونے کے حوالے سے یہ صرف مسلمانوں سے ہی متعلق نہیں بلکہ تمام انسانیت سے اس کا تعلق ہے اور وہ تمام روکیں جو رنگ' عقیدے اور مذہب کی بنا پر ہو سکتی ہیں سب کو پار کر کے پوری نوع انسانی کو مخاطب کرتی ہے۔ سورۃ بقرہ کا افتتاحی بیان ہی اس پر واضح ہے:

"یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں متقیوں کے لئے ہدایت ہے" (۵:۲)۔

قرآن شریف مطلق سچائی کی تصدیق کرتا ہے چاہے وہ ماضی سے متعلق ہو یا حال اور مستقبل سے' جو ابدی اور لازوال سچائی ہے اور اس کا اعلیٰ اور ماورائی کردار کسی ایک سوسائٹی سے متعلق نہیں چاہے وہ آغاز کے حوالے سے ہو یا زمانے کے حوالے سے۔ یہ تاریخ کا ایک گزرا ہوا واقعہ نہیں یا کوئی ایسا عجوبہ نہیں جو عبوری نوعیت کا ہو جو دماغ کو وقتی اور عارضی طور پر دھوکہ دے سکتا ہو۔ بلکہ یہ ایک دائمی اور زندہ معجزہ ہے جو اختصار' ترمیم یا مصلحت سے آج تک دوچار نہیں ہوا اور یہ حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ہر نبی کو معجزہ دیا گیا جو اس کی نبوت کا ثبوت ہوتا تھا کہ وہ کوئی جعلساز نہیں ہے۔ ہرچند کہ انبیاء انسان ہی ہوتے ہیں لیکن ان کے معجزات انسان کی اختراع نہیں ہوتے۔ وہ خدا کے تصرف اور اختیار میں ہوتے ہیں اور خدا کی طاقت اور اجازت سے ہی وقوع پذیر ہو سکتے ہیں تاکہ پیغام کے روحانی اور الہیاتی ہونے کا ثبوت مہیا ہو سکے۔

یہ معجزات عموماً انہی میدانوں میں دکھائے جاتے ہیں جن میں نبی کے مخاطب زیادہ اعجاز رکھتے ہوں۔ حضرت موسیٰؑ کے مخالف چونکہ جادو کے میدان کے ماہر تھے اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو ایسا ہی معجزہ عطا کیا گیا کہ وہ اپنے زمانے کے جادوگروں کے گرو گھنٹال کو بھی حیرت میں ڈال سکتے تاکہ وہ جان لیں کہ نبی اللہ کا بھیجا ہوا ہے کوئی عام جادوگر

یا شعبدہ باز نہیں۔ اس لئے ان کا عصا ایک اژدھا بن جاتا جو جادوگروں کے سانپوں اور سنپولیوں کو جو جھوٹے جادو کے شعبدے کے زور پر حرکت کر رہے تھے نگل گیا جن سے جادوگر حیران رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے جھک کر اللہ پر ایمان لے آئے۔

"تب موسیٰ نے اپنا عصا ڈالا تو جو وہ جھوٹ بناتے تھے تو وہ اس کے سر نگلنے لگا پس جادوگر سجدے میں گر گئے انہوں نے کہا جہانوں کے رب پر ایمان لائے" (۲۶:۴۵-۴۶)۔

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے مخالفین ماہر اطباء تھے اس لئے انہیں مادرزاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینے کا معجزہ اور مردوں کو زندہ کرنے کا اعجاز بخشا گیا۔

"اور اللہ کے حکم سے شبکور اور پھلوہری والے کو اچھا اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں" (۳:۴۹)

اسلام سے قبل عرب اپنی فصاحت و بلاغت اور شاعری پر بڑے نازاں تھے اور فصاحت و بلاغت کے مقابلے ان کے بڑے میلوں ٹھیلوں میں عام ہوتے تھے۔ اس زمانے میں جبکہ شاعرانہ بیانئے کو بہت اونچا مقام حاصل تھا قرآن ایک ایسی نثر کی زبان میں نازل ہوا جس کا انداز بیان اور ادبیت کی چاشنی معجزہ تھی اور اس کا سٹائل اس قدر دلفریب تھا کہ اس کے مخالفوں میں سے شاعروں، مقرروں، مبلغوں اور پروہتوں کو حوصلہ نہ ہوا کہ وہ قرآن کی اس دعوت مبارزت کو قبول کرتے کہ وہ اس قرآن کے مقابل اور مماثل ایک تحریر ہی لے آئیں۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے کہ اس کا ہمسر انسانی تخیل اور تفکر پیدا ہی نہیں کر سکتا چاہے وہ باہم مل کر بھی کوشش کر لیں۔

بے مثل ہونے کا دعویٰ

یہ دعویٰ کہ اس کا کوئی ہمسر اور مثل نہیں ہو سکتا۔ یہ پیغمبر نے اپنے پاس سے نہیں بنا لیا تھا بلکہ یہ قرآن پاک میں ابتدا سے انتہا تک چار بار دہرایا گیا ہے۔ جب تک نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں مقیم رہے اور پھر آخر میں اسے مدینہ شریف میں بھی دہرایا گیا۔ مکہ شریف میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی ابتدا تھی اور اس کا کوئی امکان نہ تھا کہ قرآن پاک کو عرب قبول کریں گے۔ یہ چیلنج ان دلیلوں کے ہمراہ، جو اس کی اعلیٰ، مکمل برتری کا اشارہ کر رہی تھی اور تمام دنیا کے انسانوں کو مخاطب کر کے بیان کیا گیا۔

"کہہ اگر انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ اس قرآن کی مانند بنا لائیں تو اس کی مانند نہ لا سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مددگار ہوں" (۱۷:۸۸)۔

مکی زمانے کے آخری دور میں بھی جب مخالفین اصرار پر اصرار کر رہے تھے کہ وحی الٰہی جو نبیؐ پر نازل ہوتی ہے اس کی اپنی اختراع ہے یا اس کا کوئی نائب اس کی مدد کرتا ہے اسی چیلنج کو پھر دہرایا گیا۔

"کہہ پھر اس جیسی دس سورتیں بنائی ہوئی لے آؤ اور اللہ کے سوائے جسے بلا سکتے ہو، بلا لو۔ اگر تم سچے ہو" (۱۱:۱۳)۔

اس کے فوراً بعد اس کو ایک اور زوردار چیلنج کی شکل میں دہرایا گیا۔

"کیا کہتے ہیں کہ اس نے از خود جھوٹ بنا لیا ہے کہہ ایک سورۃ اس جیسی لے آؤ اور اللہ کے سوا جسے بلا سکو بلا لو۔ اگر سچے ہو" (۱۰:۳۸)۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر شاعری کے عظیم استاد تھے اور ان کے لئے حضورؐ کو لاجواب کرنے کا شدید محرک بھی تھا لیکن تاریخ گواہ ہے کہ وہ قرآن پاک کے متن اور سٹائل جیسی ایک بھی چیز پیش نہ کر سکے۔

قرآن شریف ۱۱۴ سورتوں پر مشتمل ہے جو مختلف طوالت کی ہیں مختصر ترین سورت الکوثر (۱۰۸) صرف تین آیات پر مشتمل ہے۔ یہ روایت ہے کہ ابو جہل جو مخالفین کا سرغنہ تھا اس نے اسے اتفاقاً سن لیا اور پکار اٹھا کہ خدا تعالیٰ پاک ہے! کس حسن سے ہر ایک آیت کا قافیہ دوسرے مصرع سے مل رہا ہے۔

عربوں نے سالہا سال میں لکھے گئے شاعری کے سات عظیم نمونے چنے تھے جن کو وہ باہم متفقہ طور پر سب سے اعلیٰ قرار دیتے تھے اور جو کاغذوں پر لکھے ہوئے تھے اور ان کو خانہ کعبہ میں لٹکایا ہوا تھا۔ ابو جہل جو سورت کوثر کے قوافی اور روانی سے متاثر ہوا تھا اس نے اس سورت کو ایک کاغذ پر لکھا اور اسے سات عظیم شاعروں میں سے جو

شاعر اس وقت تک زندہ تھا اس کے پاس بھجوایا۔ جب اس شاعر نے اسے پڑھا تو وہ بھی پکار اٹھا "اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے یہ کسی انسان کا کلام نہیں"۔ وہ خانہ کعبہ میں گیا اور سات لٹکائے ہوئے عظیم قصائد کے ساتھ اسے بھی ایک چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر لکھ کر لٹکا آیا۔

یہ قرآن پاک کے بے مثل اور بے نظیر ہونے کا کھلے بندوں اعتراف تھا جو اس کے الہیاتی ماخذ کی تصدیق تھا۔

مدینہ شریف میں ہجرت کر کے آنے کے بعد یہی چیلنج اور زیادہ شدت اور شوکت بھرے لفظوں میں پھر دہرایا گیا۔

"اور اگر تمہیں اس میں شک ہے جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے تو ایک ہی سورت اس جیسی لے آؤ اور اللہ کو چھوڑ کر اپنے مددگاروں کو بلا لو اگر تم سچے ہو" (۲:۲۳)۔

یہ چیلنج مکہ کے کفار کے لئے ہی نہ تھا بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مدینہ بھی اس کا مخاطب تھا۔ بلکہ ان بستیوں پر ہی منحصر نہیں بلکہ کل دنیا کے رہنے والے اس کے مخاطب ہیں اور آج بھی یہ چیلنج اسی طرح قائم ہے حالانکہ اب بھی مغرب میں بہت سے ادیب ایسے ہیں جنہوں نے عربی زبان میں کمال مہارت حاصل کر رکھی ہے اور عربی لغت میں اہل زبان سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ چنانچہ آرتھر جے آربری لکھتا ہے:

"قرآن میں عربی زبان کا انداز بیان و خطابت، اس کا وزن اور باہمی ہم آہنگی اس قدر منفرد، زوردار اور محرک ہے کہ کوئی بھی اس کی نظیر اپنی صورت اور مزاج میں ایک بھونڈی کوشش کے سوا کچھ نہ ہو گی جو اس کی اصل چمک دمک کے سامنے ماند ہی رہے گی۔"

Arthur J. Arberry: The Koran Interpretted,

(George Allen & Unwin Ltd. London, 1955)

vol. I, p. 24.

قرآن پاک خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک سچی وحی ہے۔ اس لئے بے خطا، واضح اور انسانی طاقت سے ماوراء ہے کوئی انسان اس کی نقل بنانے پر قادر نہیں ہو سکتا۔ یہ ادبیت کا ایک نفیس اور حیران کن کھلا ہوا شاہکار ہے جو انسانوں کو اپنے نازل ہونے کے زمانے سے لے کر آج تک کھلا چیلنج دیتا آ رہا ہے۔

کامل ترین وحی

چونکہ خدا خود کامل ہے اس کی وحی بھی کامل اور غلطیوں سے مبرا ہے اس کا غلطیوں، حذف، اضافہ، تحریف، بے وجہ تکرار، تضاد اور ابہام سے پاک ہونا بھی لازمی ہے۔ قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض مرتبہ طویل اور بعض مرتبہ مختصر ٹکڑوں میں نازل ہوتا رہا جس پر تئیس سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس کے باوجود یہ ایک منظم انداز میں ہے جس میں ایک مکمل منصوبے کا اہتمام نظر آتا ہے جو کمال طور پر مربوط ہے اور تنقیص و تضاد سے پاک ہے۔ اس میں کوئی لفظ یا کوئی آیت بھی نہیں جو معیار سے گری ہوئی ہو۔ یہ اپنے تمام بیان میں ایک وقار اور متانت کا انداز رکھتا ہے۔ جو بھی لفظ اس نے چنے ہیں ان میں ایک اکرام اور اعزاز ہے اور وہ اس قدر متناسب ہوتے ہیں کہ باوجود مختصر ہونے کے وہ اپنے اندر معانی کا ایک خزانہ رکھتے ہیں۔ ایک ہی مضمون بار بار دہرایا جاتا ہے لیکن ہر مرتبہ ایسے رواں انداز میں اسے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ بیان حس جمالیات پر گراں نہیں ہوتا۔

اس کے اندر ایک ایسا مخصوص ترنم رکھا گیا ہے کہ جو مختلف حصوں میں رواں دواں چلا جاتا ہے اس کا ایک عمومی اور متوازن سٹائل ہے خیالات کے اظہار اور بیان کا ایک منطقی منصوبہ ہے جو آہستہ آہستہ تمام کتاب میں متعلقہ خیال کو بیان کرتا ہے اور آگے بڑھاتا جاتا ہے۔

اس کے زبان کی نزاکت اور متن کے وقار دونوں ہی میں ترغیب اور تحریک کی اس قدر طاقت ہے کہ روح اس سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتی ہی نہیں۔ قرآن میں آوازوں کا ایک ناقابل نقل آہنگ ہے جو انسانوں کو رلا کر وجد طاری کر دیتا ہے۔ محمد مارما ڈیوک پکتھال نے قرآن پاک کا ترجمہ کرتے ہوئے ان لفظوں میں قرآنی جادو کو بیان کیا ہے: "چودہ سو سال گزرنے کے باوجود بھی قرآن عربی زبان کی ادبیت کا ایک معجزہ رہا ہے۔ وہ زبانیں جن میں تمام مذہبی صحائف لکھے گئے تھے

اب یا تو مردہ ہو چکی ہیں یا تاریخ کے دستاویزی محافظ خانوں میں پڑی ہیں لیکن عربی جو قرآن کی زبان ہے اب بھی زندہ ہے۔ یہ قرآن پاک کی اعجازی فطرت کا ایک واضح ثبوت ہے کہ قرآن پاک نے ایک محدود علاقے میں رائج بولی کو ایک وسیع و عریض دنیا کی طاقتور اور زندہ زبان بنا دیا۔ عربی زبان اب کسی خاص قوم کی اجارہ داری بھی نہیں رہی بلکہ یہ ان سب لوگوں کی زبان بن گئی ہے جنہوں نے بھی اس دین کو اختیار کیا ہے۔"

اہل لغت کا عام خیال ہے کہ زبان جو تبدیلیوں کا اثر قبول نہیں کرتی اور تبدیل نہیں ہوتی وہ خود ناپید ہو جاتی ہے۔ ایک زندہ زبان کا نشان اس کی نرمی، لچک اور تاثیر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور یہ کہ وہ کس حد تک تبدیل ہو کر پھیلاؤ کا امکان رکھتی ہے تاکہ وہ زمانے کی ضروریات اور رویوں کا ساتھ دے سکے۔ دنیا کی زبانیں ارتقاء کے مختلف مدارج سے گزر کر اس قدر تبدیل ہو گئی ہیں کہ کسی پرانی زبان کو اس کے جدید اسلوب میں پہچاننا ہی دشوار ہو گیا ہے جب تک ڈکشنریوں، فرہنگوں اور شرحوں سے امداد نہ لی جائے۔

مثلاً اینگلو سیکسن Anglo Sexon یا پرانی انگریزی آج کل کی رائج انگریزی سے یہاں تک دور ہو چکی ہے کہ بغیر ترجمہ کے اس کا سمجھنا محال ہو گیا ہے۔ حالانکہ چوسر (Chaucer) کو انگریزی زبان کے بانیوں میں سے گنا جاتا ہے لیکن چوسر نے جو ادبی معیار بنا دیا تھا وہ سولہویں صدی میں ولیم شیکسپئر William Shakespeare کے ادبی منظر نامے پر ظہور کے ساتھ ہی اس قدر بدل گیا کہ اس کے ساتھ ہی جدید انگریزی ادب کا زمانہ شروع ہو گیا۔ اس کی نظموں اور ڈراموں نے بعد میں آنے والی نظموں اور ڈراموں کے ادب پر انتہائی گہرا اثر ڈالا لیکن شیکسپئر نے ادب کو جو رخ دیا تھا وہ سائنسی دور کے آغاز کی وجہ سے متروک ہو گئی۔

آج عظیم ڈرامہ نگاروں کی ادبی طرز میں صرف علمی حد تک دلچسپی رہ گئی ہے کیونکہ ادبی منہاج ان کے دور سے بہت حد تک بدل گئے ہیں۔ آج کی انگریزی کا بہترین ترجمان ٹی ایس ایلیٹ (T.S. Eliot) —— ڈالان تھامس (Dylan Thoumas)، جی بی شاہ (G.B. Shaw)، آل ڈوس ہکلے Aldous Huxley وغیرہ ہیں۔ اسی طرح دنیا کی دوسری زبانیں بھی اپنے بہترین ادیبوں کی تحریروں کی منہاج کے ردعمل کے سبب اپنے اپنے متعلقہ ادوار میں بدلتی رہی ہیں۔ یہ ایک عربی زبان ہی ہے جو اس عالمی رویے میں ایک استثناء ہے اور یہ قرآن کے الہامی ماخذ ہونے کا ایک قابل قبول ثبوت ہے کہ عرب دنیا کی ذہنی، سیاسی اور سماجی اتھل پتھل کے باوجود عربی زبان نے وہ اثرات قبول نہیں کئے جو دوسری زبانوں کو بدل گئے۔ عربی زبان وہی رہی جس میں قرآن کو اتارا گیا۔ قرآن شریف نے جو عربی ادب کی سطح بنا دی تھی وہ دعوت مبارزت کے باوجود اب تک لاجواب ہے اور گذشتہ چودہ سو سال میں اس سطح کو بہتر تر بھی بنایا نہیں جا سکا۔ جارج زیدان نے جو عربی ادب میں خود ایک اتھارٹی ہے باوجود مسیحی ہونے کے یہ الفاظ کہے "کسی مذہبی کتاب نے اس قدر اثر اس زبان پر نہیں کیا جس میں اس کا نزول ہوا ہو۔ جیسا یا جتنا قرآن نے عربی ادب اور زبان پر کیا ہے"۔ قرآن پاک کے حفاظتی پروں کے نیچے عربی زبان نے اپنے لہجے، قواعد، صرف اور نحو، لفظوں کی ہیئت محفوظ رکھی۔ کوئی تشبیہ، استعارہ یا محاورہ ایسا نہیں جو قرآن نے استعمال کیا ہو اور وہ اب مردود یا متروک ہو گیا ہو۔ قرآنی محاورہ زبان کی خود ایک میزان بن گیا ہے جس پر بعد میں ہونے والے استعمالات کو ناپایا جانچا جا سکتا ہے کہ وہ معیاری ہیں یا نہیں۔

قرآن کا زبان پر اس قدر اثر ہوا ہے جیسے کوئی ادیب ایک ایسے ادب پارے لکھ لائے جو اپنی ادبی شان میں اس وقت سے کہ جب سے زبان کی ابتدا ہوئی ہو ناقابل سبقت ہو۔ ایک ایسے ادب پارے کے ظہور کے بعد اس سے کمتر ادیب اس کو بدل ہی نہیں سکتا اور نہ زبان اس کی ہیئت بگاڑ سکتی ہے۔ قرآن اس دور کے مروجہ زبان میں اتارا گیا تھا اور جو مروجہ زبان کے اعلیٰ ترین اسلوب میں بیان کیا گیا۔ وہ اعلیٰ اسلوب جو اس کے یا اس کے نزول کے بعد بھی نہیں دیکھا گیا۔ ایک اعلیٰ الہیاتی اسلوب میں لکھا گیا قرآن اس سے کہیں زیادہ ارفع ہے جو ایک فانی انسان کی نگارش ہو سکتا ہو اور اب تک ایک ادبی شاہکار ہے۔

قرآن پاک کی نفوذ پذیری

قرآن کی تعلیمات آفاقی ہیں اور وہ تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کرتی ہیں اور زمان و مکان اور رنگ و نسل کی رکاوٹوں کو عبور کر جاتی ہیں۔ یہ تمام پہلوؤں اور زندگی کے تمام ادوار کے لئے راہنمائی فراہم کرتی ہیں اور چاہے وہ سربراہ مملکت ہو یا ایک عام شہری اس کی روحانی اور دنیاوی خوشحالی اور اطمینان کے لئے اس کی ہدایات کافی ہیں۔ دنیا میں امن اور جنگ کے متعلق بھی یہ بحث کرتی ہیں۔ یہ زمین پر انسانوں کو جو بھی مسائل درپیش آسکتے ہیں ان کی نشاندہی کر کے کر ان کا حل بتاتی ہیں۔ یہ عورت اور مرد کے مسائل' ان کی شادی مرگ' ان کے مسائل وراثت' فوجداری اور دیوانی قوانین اور قوموں کے باہمی تعلقات' غرض کوئی بھی مسئلہ ہو اس کے احاطہ عمل سے باہر نہیں رہا۔ قرآن جسم انسانی کو روح کی خاطر دکھ دینے کا قائل نہیں بلکہ دونوں کے درمیان انسان کے جسمانی اور روحانی خواہشات کو تسکین پیدا کر کے ایک خوبصورت توازن بناتا ہے جس سے ایک مکمل زندگی بسر کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

یہ سب ان چیزوں کی نشاندہی کرتا ہے جن کے کرنے سے انسان مشیت الٰہی (God's will) کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے۔ یہ افکار اور اعمال میں راستبازی اور دیانتداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ جہاں اعمال میں نیکی ہو وہیں نیت بھی صحیح ہونی چاہئے تاکہ ایک بامقصد زندگی گزر سکے اور تبھی عبادت کا تقدس بھی قائم رہ سکتا ہے۔ قرآن ایک آفاقی دین کی تبلیغ کرتا ہے جو غیر فرقی' غیر نسلی اور غیر عقائد پرستانہ ہے۔ جو خدا کی مشیت کے سامنے فرمانبرداری کی تعلیم دیتا ہے یہ ان لوگوں کو جو اس مسلک پر گامزن ہونا چاہتے ہیں عمل راست' ابطال باطل اور خدا تعالیٰ پر ایمان کی تلقین کرتا ہے:

"تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لئے ظاہر کی گئی ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو" (۳:۱۱۰)

قرآن بنیادی دینی سچائیوں اور مکمل ضابطہ حیات کی نہایت اعلیٰ وضاحت کرتا ہے۔

"ہم نے تجھ پر یہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کو کھول کر بیان کرنے والی ہے" (۱۶:۸۹)

یہی نفوذ پذیری کا اعجاز ہے کہ قرآن نے انسانوں کے افکار' اعمال اور ثقافت پر اس قدر گہرا' وسیع اور زبردست اثر کیا جو انسانی تاریخ میں لاثانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عربوں کی زندگی میں تیئس سال کی مختصر مدت میں ایک اعجازی انقلاب برپا کر دیا اور تاریکی میں بسنے والے بت پرست' سنگدل' بدکار اور ظالم عرب چند سالوں میں امن و آشتی اور علم کے علمبردار بن گئے اور ان کے دل میں ساری دنیا کے لوگوں کی اصلاح کا جذبہ موجزن ہو گیا۔ اور جس تحریک کا انہوں نے آغاز کیا تھی وہ ان کے بعد بھی چلتی رہی اور آج تک چل رہی ہے۔ دنیا میں اور کوئی کتاب نہیں جس نے لوگوں میں ایک مختصر مدت میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا ہو جس کے اثرات اس قدر عمیق اور دیرپا ہوں۔

قرآن کی استدلالی اور علمی فطرت

قرآنی تعلیمات بہت معقول ہیں اور جو انہیں سمجھنا چاہے وہ تعصبات سے خالی ہو کر ان تعلیمات کے دلائل کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ ایک ایسے دین کی تبلیغ کرتا ہے جس میں فکر پر کوئی قدغن نہیں۔ یہ آزادی افکار کا شارح ہے اور افسانوی یا دیومالائی حکایات اور عقائد کی غلامی سے نجات دلاتا ہے اور اس طرح توہم پرستی اور پروہیت کا جوا اتار پھینکتا ہے۔ اس کی تعلیم ناممکن کا تقاضا نہیں کرتی اور نہ ہی لاحاصل کو حاصل کرنے پر اصرار کرتی ہے اور نہ ہی انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک ایک گنہگار مخلوق قرار دے کر مطعون ملزم گردانتی ہے۔ بلکہ انسانوں کو یہ شریف' معزز اور باوقار قرار دے کر ان کو عقل کا تاج پہناتی ہے۔ قرآن میں ایسا کچھ نہیں جو انسان کے عقائد اور اعمال کو بگاڑتا ہو۔ نہ ہی ایسی کوئی بات ہے جو ناشائستہ' فحش' ظلم آور' غیر عادلانہ' گمراہی انگیز یا ناقابل عمل ہو۔ یہ اس حقیقت کا اثبات کرتا ہے جو بیرونی دنیا سے غیر متعلق نہیں بلکہ اس کے ساتھ عملاً منطبق اور مربوط اور ہم آہنگ ہے۔ یہ بار بار انسان کو رغبت دلاتا ہے کہ بیرونی دنیا یعنی اپنے باہر کی دنیا میں مطلق حقیقت کے فطرتی

نشان دیکھے اور تاریخی عمل میں اسے عامل کے طور پر محسوس کرے اور اپنے داخل میں اس کی کارفرمائی کا ادراک کرے کہ یہ سب حقیقت کے ہی مظاہر ہیں جو مشیت الٰہی کی تائید اور تصدیق کرتے ہیں جس سے یہ ہماری کائنات وجود میں آ گئی ہے۔

"آسمان اور زمین کی تخلیق میں اور رات و دن کے باہم ادل بدل میں غور کرو یقیناً ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں نشانات ہیں" (۳:۱۹۰)۔

"وہ لوگ جو خدا تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے ہیں کھڑے ہوئے' بیٹھے ہوئے یا لیٹے ہوئے اور پہلو بدلتے ہوئے یا کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہوئے" (۳:۱۹۱)۔

قرآن قیاسی نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کے برعکس انسان کو ترغیب دلاتا ہے کہ وہ عقل و فہم کو استعمال کرے۔ منطقی استدلال سے کام لے تاکہ اس کو اللہ کا پیغام سمجھ میں آ سکے اس لئے اسلام میں مذہب اور سائنس باہم مربوط رہے ہیں جبکہ یورپی سائنس دان کلیسا کی طرف سے سزا دیئے جاتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں کہ کسی سائنس دان کو بھی عقوبت پہنچائی گئی ہو۔ یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں کہ ازمنہ وسطیٰ کے عظیم دینی مسلمان دانشور عظیم سائنس دان بھی تھے اور سائنسی تحقیق کے ہراول دستہ بھی جو اپنی تجربہ گاہوں میں اسی لگن اور دلچسپی سے کام کرتے تھے جس قدر وہ اپنے مذہبی اداروں میں کرتے تھے۔

ان میں سے چند ایک کے نام یہاں درج کرنا بے محل نہ ہو گا جو اس کہکشاں کے درخشاں ستارے تھے۔ مثلاً جابر بن حیان' ا لکندی' الفرغانی' ابن اسحٰق' البیرونی' ابن سینا' الغزالی' عمر خیام۔

یہ قرآن کا اصرار ہی تھا کہ فکر و نظر کو آزاد کر دیا جائے کہ تحقیق حقائق ہو سکے جس سے ازمنہ وسطیٰ اسلامی تہذیب اور ثقافت کو مہمیز میسر آیا اور وہ عظیم کارہائے نمایاں انجام دے سکی۔ یہ ایک غیر متنازعہ ثبوت ہے کہ قرآن ایک الٰہی کتاب ہے اور اس کے اندر فطرت کے وہ مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں جو نہ صرف اس زمانہ میں بھی کسی کے علم میں نہ تھے بلکہ اب بھی بہت سوں کو معلوم نہیں۔ یہ کائنات کے بارے میں بات کرتا ہے کہ وہ کیسے تخلیق ہوا۔ یہ بتاتا ہے کہ تمام مخلوق نے کیسے پانی سے آغاز پایا' کیسے پہاڑ زمین پر توازن قائم رکھنے کا کام کرتے ہیں اور کیسے نظام شمسی کے سیارے اپنے اپنے محوروں پر گھومتے اور تیرتے ہیں۔

"کیا کفار غور نہیں کرتے کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے ان کو کھولا' ملے ہوئے تھے اور ہر زندہ چیز کو ہم نے پانی سے بنایا تو کیا یہ نہیں مانتے" (۲۱:۳۰)۔

"اور ہم نے زمین میں پہاڑ بنائے تاکہ وہ انہیں لے کر کانپے نہیں" (۲۱:۳۱)۔

"اور وہی ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو پیدا کیا اور سب اپنے اپنے فلک میں تیزی سے چل رہے ہیں" (۲۱:۳۲)۔

یہ اس سائنسی حقیقت کو بھی بیان کرتا ہے کہ پودوں میں بھی جنس ہے اور دیگر مخلوق میں بھی۔ نباتات کا علم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس قدر ترقی یافتہ تو نہ تھا کہ پودوں میں بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں لیکن ہم سورہ توبہ میں پڑھتے ہیں:

"وہ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنایا اور تمہارے لئے اس میں رستے چلائے اور بادل سے پانی اتارا پھر ہم اس کے ساتھ مختلف سبزیوں کے جوڑے پیدا کرتے ہیں" (۲۰:۵۳)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی نہ تھا جو منی کے قطرے کے مختلف مدارج کے متعلق جانتا ہو کہ کس طرح وہ انہیں طے کر کے ایک انسانی بچے کا روپ اختیار کر لیتا ہے لیکن پھر قرآن پاک ان مدارج کو بیان کرتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح آج کی سائنس نے دریافت کیا ہے:

"پھر ہم نے نطفہ کو خون کا ایک لوتھڑا بنایا اور لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا اور گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اس کو ایک اور پیدائش دے کر اٹھا کھڑا کیا۔ پس اللہ بابرکت ہے جو سب بنانے والوں سے بہتر ہے" (۲۳:۱۳-۱۴)۔

مزید برآں قرآن پاک کی صداقت کا ایک اور منہ بند کرنے والا

ثبوت بھی ہے کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ انگلیوں کے نشان طب شرعی کی ایک نہایت جدید دریافت ہے اور اس کا ذکر ہم سورۃ القیامہ میں پاتے ہیں:

"کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہیں کر سکتے۔ ہاں ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کے سارے اعضاء کو (بشمول پوروں) کو ٹھیک کریں" (۷۵:۳-۴)

انگلیوں کے پوروں کا حوالہ ان کے نقوش کی بات ہے۔

جدید تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ کوئی دو آدمیوں کی انگلیوں کے نقوش یکساں نہیں ہوتے۔ یہ خدائی تخلیق کا اعجاز ہے جو آج تک نامعلوم تھا اور حال ہی میں دریافت کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت کہ اس کا ذکر قرآن پاک میں آیا ہے یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ قرآن پاک خدا کا کلام ہے۔ یہ صرف چند ایک مثالیں ہیں۔ قرآن پاک تو فطرت کے بارے میں حوالوں سے بھرا پڑا ہے جو حال کی سائنسی تحقیق سے درست ثابت ہوئی ہیں۔ یہ اس خیال کو بھی مسترد کرنے کے لئے کافی ہے کہ مغربیوں کا خیال ہے کہ قرآن پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے جو انہوںؐ نے بائبل سے نقل کیا ہے۔ فرانس کا مشہور سائنس دان طبیب ڈاکٹر ماریس بکوئی کہتا ہے:

"ایک بے علم اور ان پڑھ شخص کس طرح ایک اہم مصنف بن سکتا ہے کہ جس کو تمام عربی ادب میں ایک ادبی امتیازی درجہ بھی حاصل ہو جائے؟ پھر وہ کس طرح فطرت کے اور سائنسی حقائق بیان کر سکتا ہے جو اس وقت کے کسی اور انسان کو بھی علم تک نہ تھے اور ان کے بیان میں ذرا برابر بھی غلطی نہیں کرتا۔"

Maurice Buccaille: The Bible, The Quran & Science, American Trust Publication 1978 (p.25)

قرآن پاک تاریخ، فلسفہ اور سوشیالوجی کے تمام پیدا کردہ سوالات کا جواب دیتا ہے۔ قرآن پاک میں بیان کردہ تفاصیل کی جدید ترین اناٹومی اور بیالوجی کی دریافتوں نے تصدیق کر دی ہے نہ صرف یہ بلکہ کاسمالوجی، فزیالوجی، ایمبریالوجی (Cosmology Physiology Embryology) نے جو کچھ دریافت کیا ہے وہ قرآن پاک بہت پہلے ہی بیان کر چکا ہے اور بہت سے اور بھی حقائق ہیں جو قرآن پاک نے بیان کئے ہیں اور ابھی تک انسانوں کی ترقی ان تک نہیں پہنچ پائی اور اپنی عدم ارتقائی سطح کے باعث ابھی تک ان حقائق کے انکشافات کے منتظر ہیں۔ بقول موریس بکوئی یہ صرف اس دور میں ممکن ہو سکا ہے کہ قرآن پاک کی بیشتر آیات جو فطرت کے مظاہر سے بحث کرتی تھیں ان کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکا ہے۔ میں اس سے اور آگے جانا چاہوں گا کہ بیسویں صدی میں اس کے خانہ داری رویے Compartmentlization سے ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ ایک اوسط درجے کا سائنس دان دانشور جو کچھ قرآن میں پڑھتا ہے اسے سمجھ بھی سکے جب تک وہ ماہرین خصوصی کی طرف رجوع نہ کریں۔ ماہرین خصوصی یا Specialist کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ ایسی آیات کو سمجھنے کے لئے اس کے قاری کو انسائیکلوپیڈیائی علم درکار ہے جو تمام علوم و فنون کا احاطہ کر سکے۔

سائنس اور علوم جدیدہ کا حوالہ دیتے ہوئے وہ رقمطراز ہے:

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی علمی سطح کا خیال رکھتے ہوئے ہم یہ گمان ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص ان بیانات کا مصنف ہو سکتا ہے جو قرآن میں فطرت کی تفصیلات کی تشریح کرتی ہیں اور ان امور کا لحاظ رکھتے ہوئے جو قرآن کی وحی کو یکتا ظاہر کر رہے ہیں، ہر غیر جانبدار دانشور مجبور ہو جاتا ہے کہ وہ تسلیم کرے کہ وہ اس کو واضح نہیں کر سکتا کیونکہ یہ تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو خالص مادی اطمینان کا تقاضا کرتی ہیں۔"

شمالی علاقہ جات (داردستان) میں عبرانی آثار قدیمہ

حفیظ الرحمٰن شیخ

"ہم نے ابن مریم اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا اور دونوں کو چشموں اور ہموار وادیوں والی بلند و بالا سرزمین میں پناہ دی" (المومنون ۵۰:۲۳)۔

گزشتہ دو دہائیوں کے عرصہ میں قراقرم اور ہندوکش کے بلند و بالا اور دشوار سلسلہ کوہسار کے آر پار پھیلے ہوئے علاقے میں بعض ایسے انقلاب آفرین حالات و واقعات رونما ہوئے ہیں کہ ان سے وابستہ سیاسی و معاشی توقعات اور مقاصد کا حصول تو ممکن نہیں ہو سکا تاہم ان حالات و واقعات کے نتیجے میں ایک انقلاب آفرین صورت حال یہ سامنے ضرور آگئی ہے کہ قراقرم و ہندوکش کے دامن میں پھیلی ہوئی انتہائی دشوار گذار سرسبز و شاداب وادیاں اب ناقابل رسائی نہیں رہی ہیں۔ دنیا بھر سے سیاحوں، محققین، مورخین اور تجار کی آمدروفت کا سلسلہ اب ہمہ اس علاقے میں جاری رہتا ہے جس سے آئے روز علمی دنیا میں حیران کن نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔

زیر نظر مضمون میں "شمالی علاقہ جات" سے مصنف کی مراد کوہ قراقرم اور ہندوکش کے دامن میں واقع وہ تمام علاقہ ہے جس میں لداخ، بلتستان، گلگت، ہنزہ، نگر، کوہ غذر، چترال، چیلاس، داریل و تانگیر اور استور وغیرہ واقع ہیں اور جسے یورپی محققین و مورخین اور سیاحوں نے اپنی تصانیف میں "داردستان" کا نام دیا ہے۔ علاوہ ازیں میں نے اپنے احاطہ تحریر میں اس علاقے کو بھی لیا ہے جسے چینی اور روسی ترکستان کا نام دیا جاتا رہا ہے اور جسے آج کل ایشیائے وسطیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس علاقے میں دستیاب ہونے والے جن آثار قدیمہ کو میں نے اپنے اس مضمون میں زیر بحث لایا ہے ان کا تعلق بنیادی طور پر اس تہذیب و تمدن سے ہے جو اس علاقے میں اس مشہور و معروف قدیم ترین تاریخی راستے کے ذریعے سے آئی جوان ایشیائی خطہ ہائے ارضی سے گزرتا تھا اور جسے "شاہراہ ریشم" یا انگریزی میں "سلک روٹ" کہا جاتا تھا۔

اس علاقے میں جن انقلاب آفرین حالات و واقعات کے ماضی قریب میں رونما ہونے کا اشارہ میں نے شروع کی سطور میں دیا ہے اس سے میری مراد سوویت یونین کی وہ تباہ کن معاشی صورتحال ہے جسے سنبھالا دینے کے لئے گورباچوف نے آخری کوشش کے طور پر "پرائستاریکا" کے عنوان سے اپنی اقتصادی فراخی کی پالیسی وضع کی تھی اور جس کا مقصد وحید" یونین آف سوشلسٹ ریپبلک آف رشیا" کے وجود کو برقرار رکھنا تھا۔ اس پالیسی کو وضع کرنے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ وسط ایشیا کی چھ مسلم ریاستوں نے سوویت یونین کی انتہائی دگرگوں معاشی صورتحال کے پیش نظر سوویت اتحاد سے الگ ہونے کا مطالبہ کر دیا تھا جبکہ گورباچوف ان ریاستوں کو سوویت یونین میں بدستور شامل رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ان کی "پرائستاریکا پالیسی" ایک ایسی کوشش تھی جس کے ذریعے وہ سوویت یونین کی گرتی ہوئی اقتصادی و معاشی حالت میں بہتری اور فراخی لانا چاہتے تھے تاکہ ایشیائے وسطیٰ کی مسلم ریاستوں کو سوویت اتحاد سے علیحدہ ہونے سے روکا جا سکے۔ مگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ ایشیائے وسطیٰ کی ریاستیں، روسی اتحاد سے الگ ہو گئیں جس کے نتیجے میں وہ "اشتراکی آہنی حصار" ٹوٹ گیا جس کی وجہ سے دنیا کے دیگر ممالک سے سیاحوں، محققین اور اس طرح کی دیگر شخصیات کی اس علاقے میں آزادانہ آمدورفت ممکن نہ تھی۔

اس علاقے میں دوسرا انقلاب آفرین واقعہ دنیا کے انتہائی بلند

ترین برف پوش اور یخ بستہ علاقے سیاچن کے محاذ پر پاک بھارت جنگ کی شکل میں رونما ہوا۔ یہ جنگ بھارتی حکمرانوں نے روسی اشاروں پر چھیڑی تھی۔ اس جنگ کا مقصد تبت خود یعنی بلتستان کے علاقے میں پاکستان کے زیر انتظام نوبرا ویلی پر فوجی قبضہ حاصل کرنا تھا تاکہ گلشیائی تغیرو تبدل سے ناپید ہو جانے والے اس قدیم ترین تجارتی راستے کو از سر نو تعمیر کیا جاسکے جو اس وادی میں سے گزر کر ایشیائے وسطیٰ کے ممالک سے ہوتا ہوا مشرق اوسط کی طرف چلا جاتا تھا اور جس کے ذریعے سے ازمنہ قدیم میں جنوبی ہندوستان' تبت و لداخ' چینی وسطی ایشیا' روسی وسطی ایشیا' افغانستان' ایران اور شرق اوسط کے علاقوں کے مابین تجارتی تعلقات استوار تھے۔ اس طرح سوویت یونین کو ایک ایسا زمینی راستہ میسر ہو سکتا تھا جس کے ذریعے وہ گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے بھارت کی بندرگاہوں کو استعمال کر سکتا تھا۔ مگر یہ کوشش بھی بری طرح ناکام ہو گئی کیونکہ پاکستانی افواج کی سیاچن گلیشیر کے علاقے میں مضبوط دفاعی اقدام نے نوبرا ویلی کی طرف بھارتی افواج کے قدموں کو بڑھنے نہ دیا۔ فوجی کارروائی کے ذریعہ نوبرا ویلی پر قبضہ کرنے کا بھارتی حکمرانوں کا منصوبہ اگرچہ ناکام ہو گیا اور اس کا فائدہ نہ بھارت کو حاصل ہوا نہ ہی سوویت روس کو البتہ لداخ و بلتستان اور گلگت کے علاقہ میں بھارت و پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے دفاعی اغراض و مقاصد کے پیش نظر نوتعمیر سڑکوں کے باعث دنیا کے مختلف ممالک سے محققین' مورخین اور سیاحوں کی آمدورفت عام ہو گئی جو اس علاقے میں پائے جانے والے آثار قدیمہ کے مطالعے سے ایسے ایسے انکشافات کر رہے ہیں جن کے باعث بعض ایسے تاریخی حقائق سے پردہ اٹھ رہا ہے جو اب تک دنیا کے علمی حلقوں میں سربستہ راز بنے ہوئے تھے۔

شمالی علاقہ جات (داردستان) میں اب تک جن آثار قدیمہ کی دریافت ہو چکی ہے ان کا تعلق دنیا کی تین معروف و مشہور تہذیبوں سے قائم ہوتا ہے۔ پہلی آریائی تہذیب' دوسری بدھ تہذیب اور تیسری عبرانی تہذیب۔ اسلامی تہذیب سے تعلق رکھنے والے بے شمار آثار بھی اس علاقے میں موجود ہیں جو دراصل آثار قدیمہ کی ذیل میں نہیں آتے بلکہ انہیں آثار جدیدہ میں شمار کیا جاتا ہے اس لئے میں نے تہذیب اسلامیہ کے آثار کو اپنی تحریر کے احاطہ میں لینا مناسب نہیں سمجھا۔

آریائی تہذیب کے آثار قدیمہ

ان آثار میں چٹانوں اور بڑے بڑے پتھروں پر کندہ انسانوں اور جانوروں کی تصاویر' جانوروں کا شکار کرتے تیر انداز گھڑ سواروں کی کندہ تصاویر' عوامی اجتماعات' خوشی کے موقعوں پر ناچنے اور طرز بود و باش سے متعلق کندہ چٹانی تصاویر اور عبارتی کتبے شامل ہیں۔ سانپ کو آریائی تہذیب میں نمایاں مقام حاصل تھا۔ بعض آثار سانپوں کی تصاویر پر مشتمل ہیں۔ اکثر تصاویر میں لوگوں کو سانپوں کا شکار کرتے دکھایا گیا ہے جبکہ کچھ ایسی کندہ تصاویر بھی ملی ہیں جن میں سانپ کو دیوتا کے روپ میں بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ چیلاس کے علاقے میں ایک کندہ چٹانی تصویر ایسی بھی دستیاب ہوئی ہے جس کا حلیہ دریائی دیوتا جیسا ہے۔ اس کا تعلق آریائی تہذیب سے بتایا جاتا ہے۔ بعض انسانی کندہ تصاویر ایسی ہیں جن میں انسانوں کے ہاتھوں میں تیر کمان پکڑے ہوئے ہیں اور ان کے سروں کے بال کھڑے دکھائے گئے ہیں۔ پروفیسر احمد حسن دانی کے بقول ان دیو ہیکل صورتوں کا صحیح جواب معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ علاوہ ازیں کچھ ایسے کتبے بھی اس علاقے میں دستیاب ہوئے ہیں جن کا تعلق بھی اصل میں آریائی تہذیب و تمدن ہی سے قائم ہوتا ہے۔ پروفیسر احمد حسن دانی کا کہنا ہے کہ ان کتبوں کی تحریریں کسی ایسی نامعلوم زبان میں ہیں جو ہم سے پڑھی نہیں جاسکتی تاہم ان کے خیال کے مطابق یہ تصاویر و تحاریر زمانہ قبل از مسیح کی ہیں اور آریائی تہذیب کے آخری ادوار کی نشاندہی کرتی ہیں۔ ان میں اور پامیر کے دوسری جانب ایشیائے وسطیٰ کے علاقے میں پائی جانے

والی چٹانی کندہ کاری میں بڑی گہری اور قریبی مماثلت پائی جاتی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس تہذیب سے تعلق رکھنے والے لوگ دراصل سطح مرتفع پامیر کے دروں سے گزر کر اس طرف آئے ہوں گے جن کا تعلق سیتھین قبیلہ سے تھا۔

بدھ تہذیب کے آثار قدیمہ

پروفیسر احمد حسن دانی کے مطابق شمالی علاقہ جات (داردستان) کے آثار قدیمہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بدھ تہذیب اس علاقے میں کب وارد ہوئی تاہم یہ بات جدید تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے کہ مہاراجہ اشوک اور بکماجیت کے زمانے میں ہندوستان سے بدھ مذہب کے پیروکاروں نے وسیع پیمانے پر نقل مکانی کی تھی۔ بعدازاں مہاراجہ بکماجیت نے بھی بدھ مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اس کے دور حکومت میں بدھ مذہب لداخ سے لے کر گلگت اور چیلاس تک کے سارے علاقے میں پھیل گیا۔ اس کی تصدیق لداخ، بلتستان، گلگت، کوہ غذر اور چیلاس وغیرہ میں پائے جانے والے آثار قدیمہ سے بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ لداخ کے علاقے میں اس زمانے سے تعلق رکھنے والے بدھ معبد خانے، چٹانوں پر کندہ بدھ کے مجسمے اور پالی زبان میں کندہ تحریری کتبے کثیر تعداد میں اب بھی موجود ہیں۔ لداخ میں عوام کی اکثریت اب بھی بدھ مت کی پیروکار ہے جس کے عبادت خانوں میں محفوظ مسودات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بدھ مذہب اس علاقے میں بکماجیت کے عہد حکومت میں ہی پھیلا تھا۔ علاوہ ازیں یاسین (گلگت) میں مہاتما بدھ کی تانبے کی بنی ہوئی ایک شبیہ بھی دستیاب ہو چکی ہے جس کا تعلق بکماجیت کے عہد حکومت سے معلوم ہوتا ہے مگر اس مورت پر تحقیق کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا لہٰذا یقینی طور پر اس کے بارے میں فی الحال یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اسے کس دور میں بنایا گیا ہو گا تاہم اتنا معلوم ہو چکا ہے کہ شمالی علاقہ جات کی چٹانی کندہ کاری میں بدھ کی جو تصاویر ان دنوں دکھائی دیتی ہیں ان میں زیادہ کا تعلق چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی سے ہے۔

کہتے ہیں کہ گلگت کے قصبے سے تین چار کلو میٹر کی دوری پر کارگاہ کی چٹان پر کندہ گوتم بدھ کی شبیہ بھی بکماجیت کے زمانے کی ہے۔ چیلاس سے ملحقہ کوہستانی علاقے میں کثرت سے ایسے کتبے اور چٹانوں پر کندہ شبیہیں دریافت ہوئی ہیں جن کا تعلق بدھ تہذیب سے ہے۔ ہنزہ کی چٹانی کندہ کاری میں ایک تحریر ایسی ہے جس کا تعلق اس زمانے سے بتایا جاتا ہے جب یہاں بدھ مت کا دور دورہ تھا۔ پروفیسر احمد حسن دانی نے اپنی تحقیق میں اس تحریر کا مفہوم ان لفظوں میں بیان کیا ہے ...... "شری چندرا وکھریا مذیا ایک فاتح ہے" ...... بلتستان کے لوگوں کی اکثریت چودھویں صدی عیسوی تک بدھ مت کے پیروکار رہی جس کے بعد یہاں کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تاہم اس علاقے میں ابھی آثار قدیمہ کی تلاش کا کام اتنا نہیں ہوا جس سے بدھ تہذیب و تمدن کے بارے میں قطعی معلومات حاصل کی جا سکیں۔

عبرانی آثار قدیمہ

شمالی علاقہ جات (داردستان) پر سیتھین اور پارتھین قبائل نے بھی ماضی میں حکمرانی کی ہے۔ یہ قبائل وسط ایشیا سے نقل مکانی کر کے سطح مرتفع پامیر کے دروں (یارخن، بروغل اور درکوت وغیرہ) کو عبور کر کے یاسین کے علاقے میں آئے اور پھر وہاں سے گلگت اور چیلاس کے علاقوں میں بھی پھیل گئے۔ سیتھین اور پارتھین غالباً پہلی صدی عیسوی میں شمالی علاقہ جات (داردستان) میں آئے اور کم و بیش چار دہائیوں تک یہاں حکمران رہے۔ عبرانی تہذیب کا رابطہ اصل میں ان علاقہ جات سے ۴۵ صدی عیسوی میں قائم ہوا۔ تاہم اسرائیلی قبائل کے افراد اس سے قبل یہاں آ کر آباد ہو چکے تھے۔ استھین اور پارتھی حکمرانوں نے اسرائیلی پناہ گزینوں سے کمال ہمدردی کا سلوک کیا۔ داردستان حکمرانوں کے جبر و استبداد سے تنگ آ کر نقل مکانی کرنے والی اقوام کے لئے نہایت موزوں و مناسب پناہ گاہ سمجھا جاتا تھا۔ بخت نصر

نے بنی اسرائیل کو اپنا مغلوب بنانے کے لئے سخت جور و ستم کا نشانہ بنایا تھا اس لئے بہت سے بنی اسرائیلی قبیلے نقل مکانی کر کے افغانستان' بلخ' بخارا' خراسان' کوہ کند' سمرقند' کاشغر' تبت' لداخ' بلتستان' گلگت' چترال' کوہستان ہزارہ' صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں اور کشمیر میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔ ڈاکٹر جوزف وولف مشنری کی حیثیت سے ۱۸۴۳ء سے ۱۸۴۵ء تک تین سال کے عرصہ میں بخارا میں مقیم رہے۔ ان کے مطابق بنی اسرائیل پناہ کی تلاش میں ترک وطن کر کے پرشیا' کروستان' خراستان' بخارا' کوہ کند' سمرقند وغیرہ میں آکر آباد ہوئے۔ اس کے اندازے کے مطابق صرف بخارا میں آکر آباد ہونے والے یہودیوں کی تعداد دس ہزار کے لگ بھگ تھی۔ ان معلومات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ اسرائیل کے دس قبائل (جنہیں بائبل میں گمشدہ بھیڑیں کہا گیا ہے) ظالم حکمرانوں کے جبرو استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لئے ترک وطن پر مجبور ہوئے اور دیگر علاقوں کے علاوہ داردستان جیسے دشوار گذار علاقے میں بھی آکر پناہ گزین ہوئے تاکہ ان کا کوئی پیچھا نہ کر سکے۔

اسرائیل کے دس قبائل جن شہروں میں آکر پناہ گزین ہوئے وہ کم و بیش سب کے سب قدیم ترین مشہور تجارتی راستے پر واقع تھے جسے سلک روٹ یا شاہراہ ریشم کہا جاتا تھا۔ یہ شاہراہ اس زمانے میں شرقی و مغربی بین الایشیائی تجارتی راستے کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ لداخ کے مقام لیہ سے بحیرہ روم تک اس کی لمبائی ۹ ہزار میل سے زیادہ تھی۔ بحیرہ روم سے لے کر مشرق بعید تک اس شاہراہ اور اس سے نکلنے والی شاخوں پر تجارتی قافلے ہمہ وقت رواں دواں رہتے تھے۔ اس تجارتی راستے پر جگہ جگہ کاروان' سرائیں' ٹیکس وصول کرنے کے مراکز اور حفاظتی چوکیاں قائم کی گئی تھیں۔ لیہ کے مقام پر آکر یہ شاہراہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی ایک شاخ درۂ مریم لا سے ہوتی ہوئی شملہ کی طرف جا نکلتی تھی اور وہاں سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں سے جاملتی تھی۔ دوسری شاخ بلتستان کی نوبرا ویلی سے ہوتی ہوئی دیوسائی کے وسیع میدان سے گزر کر کشمیر کی طرف جاتی تھی اور وہاں سے مری اور ٹیکسلا جاکر ہندوستان کے اس علاقے کی جانب چلی جاتی تھی جو اب پاکستان کہلاتا ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق واقعہ صلیب کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کی تلاش میں اسی شاہراہ ریشم پر سفر کرتے ہوئے وسط ایشیا آئے اور وہاں سے لداخ پہنچے۔ لداخ میں لیہ کے مقام پر کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ نیپال گئے اور وہاں سے پھر واپس لیہ آگئے اور بلتستان و دیوسائی سے ہوتے ہوئے سرینگر چلے گئے۔ جہاں سے وہ بدھ مذہب کے مرکزی مقام ٹیکسلا گئے اور پھر واپس سرینگر لوٹ آئے اور بقیہ ایام زندگی یہیں بسر کئے۔ اس سفر میں حضرت مریم ان کی والدہ محترم اور مریم مگدلینی ان کی ایک مرید خاتون بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ مریم مگدلینی کاشغر میں ہی رکی رہی تھیں البتہ حضرت مریم کاشغر سے لداخ' نیپال اور سرینگر و ٹیکسلا وغیرہ کے سفر میں ان کے ہمراہ رہیں۔ ٹیکسلا سے واپس کشمیر جاتے ہوئے ایک روایت کے مطابق ان کا مری کے مقام پر انتقال ہو گیا اور وہ وہیں دفن ہوئیں جہاں ان کا مزار اب بھی موجود ہے۔

کتاب کا تعارف

حقیقت معجزات

[حقیقت معجزات' حصہ اول' مصنفہ ڈاکٹر قمر زمان' شائع کردہ: سلسلہ دعوت قرآنی' ۲۔ اے' ایک بلاک نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ محترم ڈاکٹر قمر زمان صاحب نے جن کا پیشہ تو ڈاکٹری ہے لیکن انہوں نے ۴۰ صفحات پر مشتمل اس کتابچہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حوالہ سے قصص الرسل اور الوہیت مسیح کے بارے میں قرآن مجید کی آیات کی جو تشریحات اور توجیہات کی ہیں وہ کئی لحاظ سے خیال آفرین اور خیال انگیز ہیں۔ کتابچہ کے "حرف اول" میں موصوف نے اس کتابچہ کے لکھنے کی وجہ لاہور کے ایک عیسائی ادارہ "سالویشن آرمی" کی طرف سے شائع کردہ کتابچہ بعنوان "فضیلت مسیح" بیان کی ہے۔ اس کتابچہ پر کوئی تبصرہ کرنے کی بجائے ہم نے مناسب سمجھا کہ اس کتابچہ میں سے اقتباس شائع کر دیئے جائیں تاکہ قاری براہ راست اس کتابچہ کے مندرجات سے واقف ہو جائیں اور مصنف کے فہم قرآن سے مستفیض ہو سکیں۔ یہ کتابچہ مندرجہ پتہ سے مفت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کتابچہ کی طباعت نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔۔۔ ایڈیٹر]

"جہاں مذہبی پیشوائیت عقل و دلائل کی بنیاد پر کوئی چیز ثابت نہیں کرپاتی وہاں معجزات کی بناء پر ہر دیومالائی بات کو منوا لیتی ہے خواہ اس میں دین کی بنیادیں ہی کیوں نہ ہل جائیں اور جس کی وجہ سے ان عقائد کو کیوں نہ تقویت ملے جو اللہ کی کتاب کے حوالے سے غلط ہوں۔ اس لئے یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ معجزات کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے۔

آج کل ایک تحریر بھی بہت کھل کر سامنے آ رہی ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کے عقائد کی بنیاد پر جن میں معجزات مسیح سرفہرست ہوتے ہیں' سیدنا مسیح کو امام انبیاء و رسل پر افضل ثابت کیا جائے۔ مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق رسالت مآب محمدؐ تو قیامت کے روز ہی اٹھیں گے جبکہ سیدنا مسیح کا قیامت سے پہلے نزول ہو گا اس لئے سیدنا مسیح کا انتظار نہ صرف عیسائی کر رہے ہیں بلکہ مسلمان بھی اس لائن میں عیسائیوں کے پیچھے پیچھے ہیں' اور کیونکہ سیدنا مسیح کے متعلق جو عقائد مسلمانوں میں موجود ہیں وہ وہی ہیں جو عیسائیوں میں مروج ہیں بلکہ مسلمان تو شاید چند قدم آگے ہی ہیں اس لئے کیوں نہ مسلمان اور عیسائی ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں' یعنی سیدنا مسیح کو اگر الوہیت میں شریک نہیں بھی مانتے تو کم از کم ایک انوکھا نبی تو مان ہی لینا چاہئے' اس لئے کہ ان کی پیدائش معجزانہ' ان کا سیدہ مریم کی گود میں بولنا معجزانہ' اللہ کا ان کو کفار سے نجات دلانا یعنی آسمان پر لے جانا معجزانہ' ان کا آسمان پر بغیر کچھ کھائے پیئے اور بغیر رفع حاجت کے رہنا معجزانہ' مسیح کا مردوں کو زندہ کرنا معجزانہ (حالانکہ یہ خالص الوہیت کا خاصہ ہے اور قرآن میں صرف اللہ کے لئے خاص بیان کیا ہے ھو الذی یحی و یمیت۔ (۱۵۸:۷) یعنی وہ اللہ ہی ہے جو حیات و موت عطا کرتا ہے' سیدنا مسیح کی پرندوں کو تخلیق کرنا بھی معجزانہ (گو یہ بھی الوہیت کا خاصہ ہے اس لئے کہ قران میں ارشاد باری تعالیٰ ہے اللہ خالق کل شیئی (۱۰۲:۶) (اللہ ہی تمام اشیاء کا خالق ہے)' اندھوں کو بینائی اور مبروص کو شفاء عطا کرنا بھی معجزانہ' سیدنا مسیح کا یہ بتانا کہ لوگ گھر میں کیا جمع کرتے ہیں اور کیا کھاتے ہیں معجزانہ بیان کیا گیا ہے۔

یہ بات کہ سیدنا مسیح آسمان پر اب بھی زندہ ہیں جبکہ سب انسان بمع تمام انبیاء زمین میں دفن کئے گئے سیدنا مسیح کو عام انسانوں اور خصوصاً دیگر انبیاء و رسل سے ممیز کرتا ہے اس لئے کہ قران کہتا ہے ما یستوی الاحیاء و لا الاموات "زندہ اور مردے ہرگز برابر نہیں ہوتے"۔

یہ بھی مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قیامت سے کچھ عرصہ قبل سب

سے بڑا فتنہ برپا کرنے والا دجال ظاہر ہو گا جس کو نیست و نابود کرنے اور امت کی حالت کو ٹھیک کرنے کے لئے سیدنا مسیح ہی آئیں گے تو آخرالنبی کون ہوئے؟ یعنی مسلمانوں نے خود ہی رسالتمابؐ کے خاتم النبی ہونے کو غلط قرار دے دیا۔

مسلمانوں کو ان عقائد کی بنیاد پر لاجواب کرنے کے لئے اور سیدنا مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنے کے لئے پہلے بھی بہت سارا مواد لکھا جا چکا ہے جس کا مسلمانوں کی طرف سے تشفی بخش جواب کبھی بھی نہیں دیا جا سکا ہے لیکن حال ہی میں ایک کتابچہ بعنوان "فضیلت مسیح" نظر سے گزرا جو سالویشن آرمی کے ریٹائرڈ بریگیڈیئر محترم برکت مسیح نے قلمبند کیا ہے اور جس کی طباعت عامر بک سینٹر ۱۲۵ر اتا ترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور سے مارچ ۱۹۹۳ء میں ہوئی ہے۔ مسلمان علماء سے درخواست ہے کہ وہ اس کتابچے کو ضرور دیکھیں اور اگر جواب دلائل کی بنیاد پر دے سکیں تو ضرور دیں لیکن خانہ پری نہ کریں یعنی بے بنیاد جواب نہ دیں جس پر خود بھی مطمئن نہ ہوں کہ دنیا آپ کا اور آپ کے دین کا مذاق اڑائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں کہ آپ نے قرآن کو غلط مفاہیم دے کر اللہ کی کتاب کو کیا سے کیا بنا دیا ہے اور وہ امت جس کو امام الناس بننا تھا آج آپ کی وجہ سے کس طرح ذلیل و خوار ہو رہی ہے اور آپ کے عقائد کی وجہ سے عیسائیوں سے پچھلی صف میں کھڑی ہونے پر مجبور ہے۔

اگر جواب نہ بن پڑے اور محسوس ہو کہ آپ ہی کے عقائد کو دلیل بنا کر آپ ہی پر حجت قائم کی گئی ہے تو بہتر ہے آپ مسیحیت کا اعلان کر دیں کہ آپ خواہ منہ سے سیدنا مسیح کو الہ نہ کہتے ہوں لیکن آپ کے عقائد کھلم کھلا یہ بتا رہے ہیں کہ سیدنا مسیح اگر الہ نہ بھی سہی تو کم از کم الوہیت میں شریک تو ضرور تھے۔" (ص ص ۲-۴)

قصص الرسل

اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن میں رسولوں کے قصوں کو یوں ہی نہیں بیان کیا ہے' یا بقول ان لوگوں کے جو قرآن پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں تو رسولوں کے قصے بائبل سے نقل کر دیئے گئے ہیں اور وہ بھی نامکمل۔ یعنی نقل بھی کی تو وہ بھی ناقص۔ اور یہی موقف ہمارے علماء کا بھی ہے خواہ وہ زبانی اس کا اعتراف نہ کریں لیکن جس انداز میں وہ قصص الرسل بیان کرتے ہیں اس میں اور بائبل کے بیان میں سرمو کوئی فرق نہیں ہوتا۔ حالانکہ قرآن نے قصص الرسل بیان کرنے کی جو غرض و غایت بیان کی ہے اس کی اساس پر حقائق کچھ اور ہی نظر آتے ہیں۔ سورۃ الھود میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

و کلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت به فوادک ج و جائک فی هذه الحق و موعظه و ذکری للمومنین○

"جو کچھ ہم آپ کو رسولوں کی خبروں سے سناتے ہیں وہ اس لئے کہ آپؐ کے دل کو تثبیت حاصل ہو اور آپ کے پاس الحق آگیا ہے جو مومنوں کے لئے موعظت اور یاددہانی ہے" (سورۃ الھود ۱۱:۱۲۰)۔

یعنی سورۃ الھود کی اس آیت کریمہ کے تحت ہر رسول کا قصہ رسالت مابؐ کے لئے اطمینان و سکون کا باعث ہونا چاہئے تھا۔ جبکہ ایمان والوں کے لئے مزید وعظ و نصیحت کا سبب بنتا۔ اب سوچئے کہ معجزات سے ہمیں کیا واعظ و نصیحت ملتی ہے۔

یعنی اگر کوئی رسول کا قصہ ہمارے لئے دلی اطمینان اور وعظ و نصیحت یا یاددہانی کا باعث نہیں بنتا تو وہ اللہ کا بیان کردہ قصہ نہیں ہے بلکہ قرآن کے منہ میں بائبل کے مقصد کو زبردستی ڈالا گیا ہے۔ اسی طرح سورۃ النمل میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ان هذا القران یقص علی بنی اسرائیل اکثر الذی هم فیه یختلفون○

"بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے وہ بیان کرتا ہے جن میں یہ اکثر اختلاف کرتے ہیں (النمل ۲۷:۷۶)

یعنی یہ قرآن بنی اسرائیل کے قصوں کے صرف وہ حصے بیان کرتا ہے جس میں یہ لوگ اکثر اختلاف کرتے ہیں۔ اب اگر ہمارے علماء بجائے اس کے کہ ان اختلافات کو واضح کریں جن میں اہل کتاب اکثر اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں وہ بھی بنی اسرائیل کے وہی قصے دہراتے رہیں جو بائبل کی زینت ہیں تو فرق کیا ہوا؟ قرآن کا دعویٰ تو یہ ہے کہ یہ تو وہ کچھ بیان کرتا ہے جس میں بنی اسرائیل نے اختلاف کیا ہوا ہے۔ یعنی قرآن ان غلط بیانات کو صحیح کرنے آیا تھا نہ کہ انہی قصوں کو دہرانے یعنی قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس کا بیان بائبل کے بیان سے

قطعاً" مطابقت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر ہم بھی قرآن کے اس دعوے کی نفی کرتے ہوئے قرآن کے بیان کردہ قصوں کو بائبل کا ہی رنگ دے دیں تو لوگوں کا یہ کہنا کہ یہ تو اساطیر الاولین یعنی گزرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں' صحیح ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ ہم نے قرآن کو بائبل کی زبان دے دی ہے اور تمام تر وہی قصے اسی انداز میں جو بائبل میں بیان ہوئے ہیں قرآن کے نام سے بیان کر دیئے ہیں۔ سورۃ ھود کی آیت نمبر ۱۲۰ کے مطابق رسولوں کے قصوں کے دو مقاصد ہیں۔

(۱) پہلا بنیادی مقصد رسالت مابؐ کی تثبیت قلب ہے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو کہ نفاذ دین کے عمل میں کیا کیا مشکلات درپیش ہوتی ہیں۔ جس طرح گزرے ہوئے انبیاء و رسل نے مشکلات کا سامنا استقامت سے کیا اسی طرح رسالت مابؐ کو بھی انہی مراحل سے گزرنا ہے۔

دعوت و تبلیغ کے مراحل کیا ہوں گے اور اس کے نتیجے میں افراد کس طرح تیار ہوں گے۔ یہ چند لوگ کس طرح ظلم و تشدد کا نشانہ بنیں گے لیکن آخرکار یہی چند لوگ کفار کے ظلم سے نجات حاصل کرنے میں کیونکر کامیاب ہوں گے اور جماعت کی شکل اختیار کریں گے اس جماعت کی تربیت کے مراحل کیا ہوں گے اس جماعت کی قوت فرعونیوں کے لئے عصاء موسیٰ کا کام کرے گی یعنی اشداء علی الکفار ہوں گے لیکن جب یہی جماعت باہمی محبت یعنی رحماء بینھم کی تصویر پیش کرے گی تو موسیٰ کا ید بیضا ہو گی اور آخرکار ایک ریاست کا قیام عمل میں آئے گا۔

ریاست کے نظام کے کیا اصول ہوں گے' ان اصولوں کی بنیاد پر کس طرح ایک نظام تشکیل پائے گا اور یہ ریاست بین الاقوامی سطح پر کس طرح نمونہ بن کر ابھرے گی جس میں ہر طرح کا امن و خوش حالی ہو گی تاکہ دوسری اقوام عالم کو انہی اصولوں کی دعوت دی جاسکے اور وہ خود اپنے سر کی آنکھوں سے مشاہدہ کر سکیں کہ اگر وہ بھی یہ اصول اپنا لیں تو ان کے لئے کیا فوائد ہیں۔

(۲) دوسرا بنیادی مقصد قصوں میں سے ان بے بنیاد دیومالائی رنگ کو دور کرنا تھا جو تمام تر قصوں کی زینت بن گئے ہیں تاکہ بے پر کی نہ اڑائی جائے اور شیخ چلی کے ہوائی محل تعمیر کرنے کی بجائے حقیقت کی آنکھ سے ایک بااصول' عملی زندگی گذارنے کا عقلی اور منطقی لائحہ عمل ملے۔ جو موعظت و نصیحت کا باعث بنے۔

لیکن ہمارے علماء اور مفسرین نے ان اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر وہی دیومالائیت کو سینے سے لگا لیا اور قرآن کے بیان کردہ قصوں کو وہی رنگ پھر سے دے دیا جس کی قرآن نے نفی کی تھی۔

اس لئے قرآن سے بنی اسرائیل کے تاریخی واقعات سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ تشبیہات جو قرآن نے استعمال کی ہیں خوب غور سے سمجھی جائیں تاکہ ہر قصے کی تہہ تک پہنچا جاسکے۔

مثلاً سیدنا مسیح کے حوالے سے مذہبی پیشوائیت کی نفی اور اس کا توڑ اور سیدنا مسیحؑ کے متعلق الوہیت کے تصور کا انکار ہے اس لئے تمام تر دلائل انہی کے گرد گھومیں گے جب کہ سیدنا موسیٰؑ کے قصے میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی نفی ہے اور اس نظام سے کس طرح نجات حاصل کی جاتی ہے اس کے لئے ہدایات ملتی ہیں سیدنا سلیمانؑ اور سیدنا داوٗدؑ کے قصے میں سلطنت کے اصول بیان کئے گئے ہیں اور سیدنا یوسفؑ کے قصے میں ربوبیت عالمینی کے حوالے سے بات ہوئی ہے سیدنا شعیبؑ کے حوالے سے معیشت کی برائیوں کو اجاگر کیا گیا ہے اور سیدنا لوطؑ کے حوالے سے فواحش کے انجام کو بیان کیا ہے اور سیدنا صالحؑ کے حوالے سے جماعت کا بیان ہے۔

اور سیدنا ابراہیمؑ کے قصے میں شرک کا ہر پہلو سے انکار اور توحید کا جملہ پہلوؤں سے اثبات ہے مختصر یہ کہ ان تمام قصوں میں کوئی نہ کوئی مقصدیت ہے اور عملی جدوجہد نظر آتی ہے۔

الوہیت مسیح ـــ قرآن کی نظر میں

جیسے کہ عرض کیا گیا قصہ مسیح میں ایک تو مذہبی پیشوائیت کا انکار ملے گا اور امت مسلمہ کے لئے تنبیہہ کہ کہیں تم بھی اس گروہ کے ہتھے نہ چڑھ جانا۔ دوسرے سیدنا مسیحؑ کے پیروکاروں کے عقائد کے ذریعہ انہی کے عقائد کی نفی اور سب سے بڑھ کر سیدنا مسیح کی الوہیت یا مافوق البشر ہونے کا انکار۔

مثلاً سورۃ آل عمران میں سیدنا مسیحؑ کے متعلق حقائق بیان کرنے

کے بعد آیت نمبر ۶۲ میں فرمایا کہ بلاشبہ یہ ہے مسیح کی حقیقت کا برحق بیان۔ اس اللہ کے علاوہ کوئی اللہ نہیں ہے بے شک اللہ ہی غالب' حکمت والا ہے۔

اسی طرح سورۃ مریم میں سیدنا مسیحؑ کے قصے کے بیان کے بعد آیت نمبر ۳۴ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

یہ ہے وہ عیسیٰ ابن مریم کا برحق واقعہ جس کا مقام لوگ اونچا کرتے ہیں اور اللہ کی یہ شان نہیں کہ اللہ اپنے لئے کسی کو لڑکا قرار دے وہ اس سے بہت بلند و بالا ہے۔

یعنی دونوں مقام پر تمام قصے کو بیان کرنے کے بعد اللہ کا اپنی الوہیت کا اعلان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ بھی سیدنا مسیحؑ کے متعلق پہلے بیان کیا گیا ہے وہ الوہیت مسیح کے انکار اور اللہ کی بلا شرکت غیرے الوہیت کے اثبات میں بیان ہوا ہے۔ لیکن ہمارے علماء نے الوہیت مسیح کا زبانی تو انکار کیا ہے لیکن تمام عقائد بائبل سے مستعار لے لئے ہیں اور قرآن کے نام پر لوگوں کے ذہنوں میں پختہ کر دیئے ہیں۔ مثلاً قرآن نے الوہیت مسیحؑ کے انکار کے لئے ہی سیدنا مسیحؑ کو ابن مریم کہا۔ ابن مریم کہنے کا مقصود ہی مسیح کے ماننے والوں پر یہ واضح کرنا ہے کہ سیدنا مسیح کو ابن مریم کہنے والو تم خود سوچو کہ جو ایک عورت کا بیٹا ہے یعنی جو ایک عورت کے پیٹ میں سما سکتا ہے' جو تمام حمل کے مراحل سے گزرتا ہے وہ الہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ تمہارا ابن مریم کہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تم مانتے ہو کہ وہ ایک عورت کا بیٹا ہے جو ایک انسان کی بیٹی ہے پھر کیوں کر ایک انسان کی نسل کا بیٹا الہ کا بیٹا ہو سکتا ہے۔ بار بار ابن مریم کہہ کر عیسائیت کے اسی عقیدہ کی جڑ کاٹی گئی ہے لیکن ہمارے علماء اس کو بن باپ کے پیدائش کی دلیل بنا بیٹھے ہیں۔

اسی طرح سورۃ مریم میں سیدنا مسیحؑ کی ولادت کے وقت سیدہ مریم کے درد زہ کا ذکر ہے۔ کبھی کسی نے سوچا کہ قرآن میں سیدہ مریم کے درد زہ کا بیان کیا معنی و مقصد رکھتا ہے۔ ایک ایسا بیان جو عام عورت بھی بیان کرتے ہوئے شرمائے اسے اللہ پاک اپنی کتاب میں جگہ دیں' کوئی نہ کوئی اہمیت تو ضرور رکھتا ہو گا۔ اللہ پاک کسی بھی بات کو بلاوجہ نہیں بیان کرتے۔ یہ تو ہمارے علماء ہی ہیں کہ جو بات سمجھ میں نہیں آئی اسے مبہم یا منسوخ قرار دیا' یا کسی معجزے کے کھاتے میں ڈال دیا۔

قرآن میں درد زہ کا ذکر کر کے بائبل کے بیان کردہ اس عقیدہ کی جڑ کاٹی گئی ہے جو عیسائیوں کے ہاں مقبول عام ہے کہ آدم کی بیوی نے شیطان کے بہکانے پر پھل کھانے کا جو گناہ کیا تھا اس کی پاداش میں ان کو درد زہ ملا تھا۔ بائبل میں کتاب تکوین (۱۶/۳) میں مذکور ہے۔

"خدا نے عورت سے کہا "میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا۔ تو درد زہ ہی کے ساتھ اولاد جنے گی"۔

اب اگر سیدہ مریم ایک الہ کی ماں ہیں تو ان کو معصومہ ہونا چاہئے ان کو اس گناہ کی سزا میں جو آدم کی بیوی نے کیا تھا درد زہ میں نہیں مبتلا ہونا چاہئے تھا لیکن اگر سیدہ مریم کو بھی درد زہ ہوا ہو تو وہ بھی اس صف میں آ گئیں جہاں بائبل کے بیان کردہ اصول کے مطابق تمام گناہگار عورتیں کھڑی ہیں اور سیدہ مریم معصومہ نہ رہیں بلکہ گناہگارہ ثابت ہوئیں۔ پھر ایسی گناہگارہ کے بطن سے الہ کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے۔

دوسرا یہ اگر سیدنا مسیحؑ کی پیدائش معجزانہ تھی تو سیدہ مریم کو اس طبعی عمل سے کیوں گزرنا پڑا اور سیدنا مسیحؑ کی پیدائش کے وقت وہی مشکلات کیوں درپیش آئیں جو ایک عام عورت کو پیش آتی ہیں۔

اگر آپ غور کریں تو آل عمران' سورۃ مریم' سورۃ النسا اور سورۃ المائدہ میں جہاں سیدنا مسیحؑ کے متعلق سب سے زیادہ ذکر ملتا ہے' تمام تر آیات میں الوہیت مسیح کا انکار ہے" (ص ص ۲۰ تا ۲۵)۔